جلد دوم

امین احسن اصلاحی

فہرس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تزکیۂ نفس کے متعلق جو تصور صوفیاء کے واسطے سے رائج ہوا ہے اور جس سے عام طور پر لوگ واقف ہیں وہ انفرادی زندگی میں اپنی ذات کی اصلاح کا تصور ہے۔ اگر ایک شخص دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑتا، لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر اللہ اللہ کرتا اور بظاہر پاکیزہ زندگی گزارتا ہے تو اسے بہت بڑا عارف باللہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں میں اس کی بزرگی کا شہرہ ہو جاتا ہے، لوگ اس کی دعا اور نظرِ عنایت کے طالب بن جاتے ہیں اور اس کی ذات مرجعِ خلائق بن جاتی ہے۔ تزکیۂ نفس کا یہ تصور نہیں نہ قرآن مجید ہی سے ملتا ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی زندگی ہی اس پر شاہد ہے۔ وہاں ہم تزکیہ کے جس مفہوم سے آگاہ ہوتے ہیں اس میں سب سے پہلے علم و عقیدہ کی اصلاح آتی ہے، عمل میں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا حکم دیا جاتا ہے، عبادات خالی رسوم ہونے کے بجائے گہری حکمت پر مبنی اور بعض مقاصدِ تربیت کی حامل نظر آتی ہیں۔ آدمی کی زندگی کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے اس کو احکام دیے جاتے ہیں جن کی رو سے وہ اپنا تعلق ایک طرف خدا سے اور دوسری طرف انسان سے جوڑتا ہے۔ اس طرح تزکیۂ نفس کوئی انفرادی اصلاح کا کام ہی نہیں رہ جاتا بلکہ اس میں انسان کی اجتماعی ذمہ داریوں کا تصور

بھی شامل ہوجاتا ہے اور سب سے بڑا عارف وہ شخص ہے جو دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو اس طرح ادا کرے جس طرح ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا اور جس کا کامل نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہمیں نظر آتا ہے۔

تزکیہ علم و عمل اور تزکیہ عبادات میری کتاب "تزکیہ نفس" کی پہلی جلد کا موضوع ہیں۔ تزکیہ تعلقات کے مباحث اس کتاب کی دوسری جلد میں شامل ہیں جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب میں میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ خدا اور بندوں کے ساتھ ایک آدمی کے تعلق کی بنیادیں قرآن و سنت کی رو سے کیا ہیں اور اس تعلق کے تقاضے کیا ہیں۔ صوفیاء کے رائج کردہ تصور کے مطابق تو آدمی کے مرتبہ کی معراج یہ ہے کہ وہ بھی غیب دان ہوجائے، اس کا فرمایا ہوا گفتہ اللہ ہوجائے، اس کی پھونک دمِ مسیحا کا کام کرے اور اس کی ذات ذاتِ خداوندی ہی کا ایک پرتو بن جائے۔ میں نے قرآن و سنت کی رو سے بتایا ہے کہ آدمی کا خدا کا مطیع و فرمانبردار بندہ بننا اس کے تزکیہ کا منتہا ہے۔ اسی طرح زندگی کے مسائل سے فرار کوئی نیکی نہیں بلکہ آدمی کا اپنے کنبہ میں والدین کا خدمت گزار اور وفادار ہونا، اعزہ و اقارب کے ساتھ احسان کرنا، بیوی بچوں کا خیال رکھنا اور ان کی اچھی تربیت کرنا، معاشرے کی اصلاح کرنا اور ریاست کا خیرخواہ ہونا تزکیہ نفس کے تقاضوں میں شامل ہے۔

ممکن ہے بعض قارئین یہ محسوس کریں کہ تزکیہ تعلقات کی بحث میں میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ تعلق کو بیان نہیں کیا۔ اس کو یہاں بیان نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس موضوع پر کتاب کی جلدِ اوّل میں اسوۂ حسنہ کے تحت مفصل بحث ہوچکی ہے۔

میری اس کتاب کے ساتھ تزکیۂ نفس کے تمام اہم نظری و عملی مباحث مکمل ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد ضرورت اس امر کی ہے کہ صبر، شکر، توکل، خوف، رجا، رضا وغیرہ صفات کو اہلِ تصوف نے جو معنی پہنا دیے ہیں ان کا جائزہ قرآن و سنت کی روشنی میں لیا جائے۔ کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ صوفیاء ان اصطلاحات سے جو کچھ مراد لیتے ہیں وہ اس سے بہت کچھ مختلف ہے جو دین نے ہمیں سکھایا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو لوگوں کی اصلاح اور ان کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کا ذریعہ بنائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

لاہور

۲۰ فروری ۱۹۸۹ء

ایمان اور اسلام

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی جامع تعبیر ایمان اور اسلام کے دو لفظوں سے کی گئی ہے۔ یہ دونوں لفظ اگرچہ عام استعمال میں ایک دوسرے کے قائم مقام کے طور پر بھی آتے ہیں اس لیے کہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں لازم و ملزوم ہیں، حقیقی ایمان کے لیے لازم ہے کہ اس کے ساتھ اسلام بھی پایا جائے اسی طرح حقیقی اسلام کے لیے شرط ہے کہ اس کے ساتھ ایمان بھی ہو۔ اگر ایمان موجود نہ ہو اور اسلام کا دعویٰ کیا جائے تو وہ منافقانہ اسلام ہے جس کا حقیقت کی میزان میں کوئی وزن نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر کوئی ایمان کا مدعی ہے، لیکن اسلام سے عاری ہے تو اس کا دعوائے ایمان محض ادعا ہے جس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں۔

ایمان اور اسلام لازم و ملزوم ہیں :

اس اشتراک اور لزوم کے باوجود دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ ایمان کا تعلق اصلاً ان بنیادی عقائد اور اساسی کلیات کے اعتقاد و اقرار سے ہے جن سے دین کی تمام شاخیں پھوٹتی ہیں اور اسلام کا اطلاق اصلاً ان عبادات، احکام اور قوانین کی اطاعت اور فرماں برداری پر ہوتا ہے جو ایمان کے مقتضیات کے طور پر اللہ تعالیٰ

اور اس کے رسول کی طرف سے دیے گئے ہیں۔ اس پہلو سے کہہ سکتے ہیں کہ ایمان کا تعلق عقائد سے اور اسلام کا تعلق اعمال سے ہے۔ لیکن ان کے درمیان یہ فرق محض علمی دائرہ میں ہے۔ ایک مومن کی زندگی میں یہ دونوں باہم مل کر وجود پذیر ہوتے ہیں اور اسی وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک یہ باہم مربوط رہیں۔ اگر ان میں جدائی ہو جائے تو دونوں ہی معدوم ہو جاتے ہیں، نہ ایمان باقی رہتا نہ اسلام۔

ایک عام غلط فہمی کا ازالہ:

اس زمانے میں لوگوں کے اندر یہ گمراہی بہت عام ہے کہ وہ نجات کے لیے صرف چند باتوں کو مان لینا کافی سمجھتے ہیں، اعمال و اخلاق کو کوئی اہمیت نہیں دیتے کہ اس پر نجات کو منحصر سمجھیں۔ یہ گمراہی پہلے صرف بعض فرقوں میں محدود تھی، لیکن اس زمانہ میں یہ ہماری اکثریت کا دین بن گئی ہے، یہاں تک کہ اب اس کے خلاف کچھ کہنا بھی آسان نہیں رہا۔ افسوس ہے کہ یہ بات جتنی ہی عام اور مقبول ہے اتنی ہی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے خلاف ہے۔ قرآن میں 'اٰمَنُوْا' کے ساتھ 'وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ' اس اہتمام و التزام کے ساتھ آتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ہر مومن کے ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس سے اعمالِ صالحہ وجود پذیر ہوں۔ مثلاً فرمایا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا	مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا
ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ	جائے ان کے دل دہل جائیں اور جب اس
وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ	کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ ان کے
زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى	ایمان میں اضافہ کریں اور وہ اپنے رب
رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۖ اَلَّذِيْنَ	ہی پر بھروسہ رکھیں۔ جو نماز کا اہتمام کریں

يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط

اور اس مال میں سے، جو ہم نے ان کو بخشا ہے، خرچ کریں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

(الانفال - ۸ : ۲ - ۴)

قرآن نے ایمان کو ایک ایسے مثمر درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی اور اس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں اور وہ برابر ہر موسم میں ثمر باری کر رہا ہو:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ط

(ابراھیم - ۱۴ : ۲۴ - ۲۵)

کیا تم نے غور نہیں کیا، کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ ایک شجرۂ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے۔

آیات میں 'کلمۂ طیبہ' سے مراد ظاہر ہے کہ کلمۂ ایمان ہے۔ اس کی تمثیل اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے ثمر بار درخت سے دی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی اور اس کی شاخیں فضا میں خوب پھیلی ہوئی ہوں اور وہ برابر ہر موسم میں اپنے رب کے فضل سے ثمر باری کر رہا ہو۔ زمین میں جڑوں کے گہرے اترنے سے مقصود فطرتِ انسانی کے اندر اس کا رسوخ واستحکام ہے کہ وہ گھورے پر اگے ہوئے پودے کی مانند نہیں ہے، جس کی کوئی جڑ نہ ہو حوادث کا کوئی معمولی سا جھونکا بھی اس کو اکھاڑ پھینکے جیسا کہ کلمۂ کفر کی بابت فرمایا ہے کہ: اُجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (ابراھیم - ۱۴ : ۲۶) (جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ دیا جائے، اسے ذرا بھی ثبات حاصل نہ ہو)۔ بلکہ وہ ایک تناور

درخت کے مانند اتنی پائدار اور گہری جڑیں رکھتا ہے کہ اگر اس پر سے طوفان بھی گزر جائیں جب بھی وہ ذرا متاثر نہ ہو۔ پھر اس کی فیض بخشی اور ثمر باری کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ ٹھونٹھ درخت کے مانند نہیں ہے، جس سے نہ کسی کو سایہ حاصل ہو نہ پھل، بلکہ اس کی فضا میں پھیلی ہوئی سایہ دار شاخوں کے سایے میں قافلے آرام کرتے اور ہر موسم میں اس کے پھلوں سے غذا اور آسودگی حاصل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ ان فیوض و برکات کی طرف ہے جو ایک صاحبِ ایمان کے ایمان سے خود اس کی زندگی اور اس کے توسط سے ان لوگوں کی زندگیوں پر مترتب ہوتے ہیں جو اس سے کسی نوعیت سے قرب کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ یہ فیوض و برکات لازماً علمی اور عملی، دونوں ہی قسم کے ہوتے ہیں جو اس کے ایمان کی شہادت دیتے ہیں اور ان سے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف رفعت و سرفرازی حاصل ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ	اسی کی طرف صعود کرتا ہے پاکیزہ کلمہ اور
وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ط	عملِ صالح اس کلمہ کو سہارا دیتا ہے۔

(فاطر - ۳۵ : ۱۰)

اس آیت پر تدبر کیجیے تو اس سے یہ حقیقت واضح ہوگی کہ کلمۂ ایمان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف صعود کی فطری صلاحیت مضمر ہے، لیکن وہ اس کے لیے سہارے کا محتاج ہے جو اس کو عملِ صالح سے حاصل ہوتا ہے۔ گویا اس کی مثال انگور کی بیل ہے، جس کے اندر فضا میں بلند ہونے، پھیلنے اور پھل پھول دینے کی صلاحیت تو ہوتی ہے، لیکن اس کی یہ صلاحیت بروئے کار اس وقت آتی ہے جب اس کو کسی ٹٹی اور چھپر کا سہارا حاصل ہو جاتے۔ اگر یہ سہارا نہ حاصل ہو تو وہ اپنی جگہ ہی پر سکڑ کے رہ جاتی اور اس کی تمام صلاحیتیں مرجھا جاتی ہیں۔

اسی وجہ سے حقیقی ایمان کے ثبوت کے لیے ضروری ہوا کہ رسول کی کامل اطاعت

یا بالفاظِ دیگر کامل اسلام کی عملاً شہادت دی جائے۔ اگر کوئی شخص ایمان کا مدعی ہو اور وہ اپنے عمل سے یہ شہادت نہ فراہم کر سکے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی ذات کی قسم کھا کر اس کے ایمان کی نفی کی ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ جو اپنے اسلام کی شہادت نہ پیش کر سکے اس کے ایمان کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى	پس نہیں، تیرے رب کی قسم، یہ لوگ
يُحَكِّمُوكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ	مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات
ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ	میں تمہی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا	کر دو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی
تَسْلِيْمًا ۝	محسوس کیے بغیر اس کے آگے سرِ تسلیم
(النسآء - ۴ : ۶۵)	خم نہ کر دیں۔

اس آیت میں خطاب ان منافقین سے ہے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے تھے، لیکن ان کے روابط مدینہ کے آس پاس کے ان یہودی قبائل سے بھی تھے جن کو ابھی مدینہ کی حکومت پوری طرح مستحکم نہ ہونے کے سبب سے اپنے اپنے حدود میں کچھ سیاسی قوت حاصل تھی۔ چنانچہ یہ منافقین اپنے مقدمات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لانے کے بجائے ان کی عدالتوں میں اس توقع سے لے جاتے کہ رشوت اور سفارش کے ذریعہ ان سے اپنے منشا کے مطابق فیصلہ حاصل کر سکیں۔ ان کی نسبت قسم کھا کر فرمایا کہ ان کا دعوائے ایمان محض لاف زنی ہے اگر ان کا عمل ان کے ایمان کے خلاف ہے۔ ان کے ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ یہ رسول کو اپنی زندگی کے معاملات میں حَکَم مانیں اور بے چون و چرا اس کے فیصلوں کی اطاعت کریں۔ اس اسلام کے بغیر ان کا ایمان معتبر نہیں۔

یہی حقیقت دوسرے الفاظ میں یوں واضح فرمائی گئی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا	رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہیں
وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ	پڑے اور اپنے مال اور اپنی جانوں
اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ	سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝	سچے ہیں۔

(الحجرات - ۴۹ : ۱۵)

ایمان اور اسلام جامد نہیں ہیں :

ایمان اور اسلام کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ جامد اور غیر نامی نہیں، بلکہ ان میں دم بدم اضافہ ہوتا رہتا ہے اگر ان کی پرورش و پرداخت کی جائے اور یہ مضمحل بلکہ مردہ اور بے جان ہو جاتے ہیں اگر ان کی دیکھ بھال نہ کی جائے۔ دنیا کی دوسری نامی اور ذی حس چیزوں میں قدرت کا جو قانون جاری ہے وہی قانون ان میں بھی کارفرما ہے۔ ان لوگوں کے ایمان و اسلام میں برابر افزونی اور برکت ہوتی رہتی ہے جو اس کائنات میں تفکر کرتے اور اس کے اندر اس کے خالق کی شانوں، اس کی قدرتوں، اس کی حکمتوں اور اس کی رحمت و ربوبیت کے عجائب کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو ان قوانین و سنن پر نگاہ رکھتے ہیں جو اس دنیا میں جاری ہیں اور جو ایسے بے لاگ اور اٹل ہیں کہ نہ کبھی ان کے ظہور میں تخلف ہوتا اور نہ وہ کبھی جانب داری برتتے۔ جو اپنی روزمرہ زندگی میں اپنے رب کے تمام چھوٹے بڑے احکام پر عمل کرتے اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا تجربہ کرتے ہیں۔ جو اس کے صبر و شکر کے امتحانوں سے گزر کر ہر امتحان کے بعد ایک نئی زندگی اور نیا عزم و حوصلہ حاصل کرتے ہیں اور خاص طور پر ان لوگوں کے ایمان و اسلام میں یہ افزونی سب سے زیادہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں برابر تدبر کرتے

ہیں اور ان کی زبانوں پر دل کی گہرائیوں سے یہ دعا جاری رہتی ہے کہ "انی اسئلک بکل اسم ھولک، سمیت بہ نفسک او انزلتہ فی کتابک او علمتہ احداً من خلقک ان تجعل القرآن ربیع قلبی و نور صدری و جلاء حزنی و ذھاب ھمی و غمی[1]" (اے رب! میں تیرے ہر اس نام سے جو تیرے لیے ہے، جس سے تو نے اپنے کو موسوم کیا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینہ کا نور، میرے غم کا مداوا اور میری فکر و پریشانی کا علاج بنا دے)۔

اِن کے بعد اُن لوگوں کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہی جو ان اوصاف سے محروم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اپنے ایمان و اسلام کو تازہ و شاداب رکھنے کے لیے اس قسم کا کوئی اہتمام نہیں کریں گے، جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا، ان کا ایمان و اسلام دیکھ بھال سے محروم ہونے کے سبب سے جلد فنا ہو جائے گا۔ اس کی مثال اس پودے کی ہے جو اتفاق سے ان کے صحن میں اگ تو پڑا، لیکن نہ تو اس کو کبھی پانی اور کھاد کی شکل دیکھنی نصیب ہوئی، نہ کبھی اس کی گڑائی ہوئی اور نہ کبھی اس کو ناموافق ہواؤں اور اس کو تباہ کرنے والی بیماریوں سے بچانے کی کوشش کی گئی۔

اِس باب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت، جو اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے وہ یہی ہے کہ وہ ایمان بخشنے کو تو بہتوں کو بخش دیتا ہے، لیکن یہ پروان انہی کے اندر چڑھتا ہے جو اس کی قدر کرتے اور اس کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ یہ قاعدہ کلیہ ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

---

[1] مسند احمد بن حنبل: الجزء ۱، ص ۳۹۱

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ

(ابراهیم - ۱۴ : ۷)

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم میری نعمت کے شکرگزار رہے تو میں اس میں بڑھوتری بخشوں گا۔

کسی نعمت کی صحیح شکرگزاری یہ ہے کہ اس کی دل سے قدر کی جائے اور اس کا حق صحیح صحیح ادا کیا جائے۔ اگر اس کا حق ادا نہ کیا جائے تو آدمی نہ صرف اس کے نفع سے محروم ہو جاتا ہے، بلکہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے ارشاد کے بموجب وہ اس کی اصل سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے ایمان و اسلام میں اللہ تعالیٰ خاص طور پر افزونی بخشتا ہے جو ان شدائد و مصائب کے مقابل میں اپنے ایمان و اسلام پر ثابت قدم رہتے ہیں جو، اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق، اس کے ایمان و اسلام کی آزمائش ہی کے لیے ظہور میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں وہ یوں ہی چھوڑ نہیں دیے جاتے، بلکہ وہ مختلف قسم کے چھوٹے بڑے امتحانوں میں ڈال کر پرکھے جاتے ہیں کہ ان کے دعوے میں کچھ صداقت ہے یا وہ محض زبان کے غازی ہیں۔ اس امتحان میں اگر وہ فیل ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے دفتر سے ان کا نام مومنوں کی فہرست سے خارج کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ مشکلات کا مقابلہ کر کے اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنے کا حوصلہ کرتے ہیں تو اس کی طرف سے اس جدوجہد کے لیے بھی قوتِ ایمانی کا بدرقہ عنایت ہوتا ہے اور امتحان میں کامیابی کے بعد امتحان کے درجہ اور کامیابی کی نوعیت کے اعتبار سے ان کے ایمان میں بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اس سنتِ الٰہی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ محض یہ کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم

لَا يُفْتَنُوْنَ ○ ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے

(العنکبوت - ۲۹ : ۲)

اس امتحان میں ثابت قدمی دکھانے والوں کی اللہ تعالیٰ جس طرح مدد کرتا ہے اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے :

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۖ یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں مزید افزونی عطا فرمائی۔

(الکہف - ۱۸ : ۱۳)

یہ آیت اصحاب کہف کے ذکر کے سلسلہ میں اس مقام پر آئی ہے جب ان کی قوم نے ان کو یہ دھمکی دی ہے کہ اگر وہ اپنی دعوتِ توحید سے باز نہ آئے تو لازماً سنگسار کر دیے جائیں گے۔ قوم کے اس فیصلہ سے مرعوب ہو کر اپنا دین چھوڑنے کے بجائے انہوں نے اس پر مضبوطی سے قائم رہنے کا عزم بالجزم کیا اور اپنے رب سے دعا کی کہ اے رب! اب آگے کے مراحل میں راہ کھولنے والا تو ہے۔ ان کی اس عزیمت اور اس دعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی قوتِ ایمانی میں اتنا اضافہ کر دیا کہ وہ تمام مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے پوری طرح اہل ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی وہ شانیں ان کے لیے ظاہر ہوئیں جن کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

یہی جوشِ ایمان سچے مسلمانوں کے اندر اس وقت ابلتا جب منافقین ان کو یہ ڈراوے سناتے کہ دشمنوں کی تمام قوتیں تمہیں فنا کر دینے کے لیے مجتمع ہو رہی ہیں تو یہ چیز ان کو مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کی بجائے ان کے ایمان کو اور زیادہ بڑھانے والی بنتی۔ فرمایا ہے :

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ (منافقین اہلِ ایمان کو ڈراتے ہیں) کہ دشمن نے تمہارے لیے بڑی طاقت اکٹھی

إِيْمَانًا قف   کی ہے تو اس سے ڈرو تو اس چیز نے

(آل عمران - ۳ : ۱۷۳)   ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا۔

اہلِ ایمان کی یہ خصوصیت قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ جب اعداء ان کے ایمان کی راہ میں اڑنگے ڈالتے ہیں تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے قوت خود ان کے ایمان ہی کے سرچشمہ سے ملتی ہے۔ رکاوٹوں کے مقابل میں اہل ایمان کا عام حال یہ بیان ہوا ہے:

فَأَمَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ   سو جو سچ ایمان لائے ہیں وہ ان

إِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝   کے لیے ایمان میں اضافہ کرتی ہے

(التوبة - ۹ : ۱۲۴)   اور وہ اس سے بشارت حاصل کرتے ہیں

یعنی منافقین جن باتوں سے ڈرتے اور دوسروں کو ڈراتے ہیں وہی باتیں اہلِ ایمان کے ایمان اور ان کے عزم و حوصلہ کو بڑھاتی ہیں: ~

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو

تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

اہلِ ایمان کے اس کردار کی طرف یہ آیت بھی اشارہ کر رہی ہے:

وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا   (اہلِ ایمان کہتے ہیں کہ) اللہ اور اس کے

زَادَهُمْ إِلَّا إِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝   رسول نے بالکل سچ کہا (وہی باتیں پیش آئی

(الاحزاب - ۳۳ : ۲۲)   ہیں جو پہلے بتا دی گئی تھیں)۔ اور اس چیز نے

ان کے ایمان و اطاعت ہی میں اضافہ کیا۔

ایک ضروری تنبیہ:

یہاں ایک تنبیہ بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ سے یہ بات

منسوب کی جاتی ہے کہ وہ ایمان کے گھٹنے یا بڑھنے کے قائل نہیں تھے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ ہمارے اس دعوے کے خلاف پڑتی ہے جو ہم نے اوپر کی سطروں میں پیش کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات کا کوئی خاص محل ہوگا جس کی طرف لوگوں کی نظر نہیں گئی ہے ورنہ ایک جلیل القدر امام ایک ایسی بات کس طرح فرما سکتے ہیں جو بظاہر قرآن و حدیث، دونوں کے خلاف نظر آتی ہے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات کا صحیح محل یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو قانونی اور فقہی ایمان سے متعلق ملیے۔ قانون صرف ظاہر سے بحث کرتا ہے، کسی شے کی حقیقت اور اس کے کیف و کم سے بحث کرنا اس کے مقصد سے خارج بھی ہے اور اس کے دائرہ امکان سے باہر بھی۔ اس کے نزدیک ہر وہ شخص جو چند معلوم باتوں کا اقرار اور چند معروف رسوم کو ادا کرتا ہے، مومن اور مسلم ہے۔ اس امر سے اس کو کچھ بحث نہیں کہ وہ جن باتوں کا اقرار کرتا ہے ان کو دل سے مانتا اور ان کا یقین بھی رکھتا ہے یا محض زبان سے ان کا اقرار کرتا ہے۔ اسی طرح وہ جن رسوم پر عمل کرتا ہے محض ظاہر دارانہ کرتا ہے یا اس کے اندر کچھ صدق و اخلاص بھی ہوتا ہے۔ یہ سوالات اس کے مقصد سے غیر متعلق بھی ہیں اور ان کی تحقیق کا اس کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔ اس کا اصل کام اسلامی سٹیٹ کے شہریوں کے لیے ایک معیار معین کرنا ہے جس کو سامنے رکھ کر وہ ان کی نزاعات اور ان کے حقوق کا فیصلہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ معیار سب کے لیے یکساں ہوگا اور اس کے تعین میں صرف وہی چیزیں کام دے سکتی ہیں جو بالکل ظاہر ہوں۔ وہ چیزیں اس میں کام دینے والی نہیں بن سکتیں جن کا تعلق باطنی کیفیات اور حقائق سے ہے۔

اس پہلو سے غور کیجیے تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا ایک عمدہ محل مل جائے گا۔ ان کی بات نہ قرآن و حدیث کے خلاف محسوس ہوگی نہ ہمارا مسلک ان کے مسلک

سے متصادم ہوگا۔ اس طرح کی بعض اور باتیں بھی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہیں جو بظاہر قرآن و حدیث کے خلاف معلوم ہوتی ہیں حالانکہ وہ اپنے اصل مقام میں بالکل صحیح ہیں، لیکن لوگوں نے ان کے موقع کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

اسلام کے کامل نمونہ :

اسلام کے کامل نمونہ کی حیثیت سے قرآن نے سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام کا ذکر کیا ہے۔ جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ لازماً وہ ایمان کے بھی نمونۂ کامل ہیں۔ ہم مضمون کی تمہید میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ایمان اور اسلام، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں افتراق صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب یہ صرف ظاہراً پائے جاتے ہوں۔ حقیقتاً پائے جانے کی صورت میں ان میں افتراق ممکن نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کامل نمونۂ اسلام کی حیثیت سے پیش کیے جانے کی وجہ یہ ہے کہ خاص اسلام کے امتحان میں انہوں نے جو شاندار کامیابی حاصل کی وہ تنہا ان کا حصہ ہے۔ اس آسمان کے نیچے کسی کو اللہ تعالیٰ نے اس امتحان میں نہیں ڈالا، صرف انہی کو ڈالا اور خود اللہ تعالیٰ نے تصدیق فرمائی ہے کہ آپ نے سو فی صد کامیابی حاصل کی۔

اسلام کی تعبیر عام طور پر "گردن نہادن بطاعت" سے کی جاتی ہے۔ یہ تعبیر بالکل مطابقِ حقیقت ہے۔ جس نے اپنا سب کچھ اپنے رب کے حکم پر قربان کر دینے کے لیے اپنے کو تیار کر لیا وہ مُسلم ہے۔ ایک مسلم کا شعاری کلمہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ' (الانعام - ۶ : ۱۶۲) (میری نماز اور قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ، ربّ العالمین کے لیے ہے) ہے۔ سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام نے اپنی عملی زندگی سے اس کی شہادت دی اس وجہ سے وہ اسلام کے کامل مظہر قرار پائے۔ وہی ہیں جنہوں

نے اپنے لیے مسلم بنائے جانے کے ساتھ ساتھ اپنی ذرّیت میں بھی ایک امتِ مسلمہ برپا کرنے کی دعا کی :

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ	اے ہمارے رب ! ہم دونوں کو تو اپنا
وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً	فرمانبردار بنا اور ہماری ذرّیت میں سے
لَّكَ ص	تو اپنی ایک فرمانبردار امت اٹھا۔

(البقرۃ - ۲ : ۱۲۸)

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اس کی قبولیت کے نتیجہ میں سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی ذرّیت میں خاتم الانبیاء، محمد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی جو ایک عظیم امتِ مسلمہ کے داعی اور مؤسس ہوئے اور سیدنا ابراہیمؑ نے جس امت کا نام 'امت مسلمہ' اپنی دعا میں تجویز کیا تھا جب اس کی بعثت ہوئی تو اس کا نام امت مسلمہ رکھا گیا۔ اس کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ کیا :

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ	اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا اس سے
قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا	پہلے۔ اور اس قرآن میں تمہارا نام
(الحج - ۲۲ : ۷۸)	مسلم ہے۔

یہ بات بھی یہاں یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کا اصل دین، اسلام ہی ہے: إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ ' (آل عمران - ۳ : ۱۹) (اللہ کا اصل دین اسلام ہے)۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اسی دین پر تھے۔ دوسرے نام اسلام کے سوا جو اختراع کیے گئے وہ بدعت کی راہ سے اختراع کیے گئے۔ یہ امت ـــــ امتِ مسلمہ ـــــ دنیا میں اس لیے برپا کی گئی کہ اسلام کے نام اور اس کی روح، دونوں کی حامل بنے۔

اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔

باب ۲

تعلق باللہ اور اس کی اساسات

تعلقات میں سب سے پہلے جو تعلق زیر بحث آتا ہے وہ آدمی کا تعلق اپنے رب کے ساتھ ہے۔ اسی تعلق کے صحیح شعور اور اس کی صحیح معرفت سے آدمی کو دوسرے تعلقات کے صحیح حقوق و فرائض کی شناخت ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارا تعلق ہماری ذات کے ساتھ کن بنیادوں پر قائم ہے، خاندان، قبیلہ، قوم، حکومت، اور ریاست کے ساتھ ہمارے تعلق کی اساسات کیا ہیں اور بنی نوع انسان کے ساتھ ہم کن روابط کے ساتھ وابستہ ہیں۔

ان تمام تعلقات کی بنیادیں اگر واضح ہو کر سامنے آجائیں اور آدمی ہر غلط بندھن کو توڑ دے اور ہر صحیح رشتہ کو استوار کر لے تو وہ اپنے رب کا فرماں بردار بندہ، اپنے خاندان اور کنبے کا ایک لائق فرد، اپنی ریاست کا ایک خیرخواہ و وفادار شہری اور دنیا میں ایک سچا محبِ انسانیت بن جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کو حاصل کر کے درحقیقت ایک انسان ایک صحیح تربیت یافتہ اور ایک پاکیزہ انسان بنتا ہے اور اسی طرح کا تربیت یافتہ اور پاکیزہ انسان بنانا اس تزکیہ کا اصل مقصود ہے جس کی تعلیم حضراتِ انبیاء علیہم السلام نے دی ہے۔ اگر انسان کے ان تعلقات کا کوئی گوشہ بھی ناہموار رہ جائے تو صرف یہی نہیں کہ اس گوشہ میں وہ تزکیہ کی برکت سے محروم رہتا ہے، بلکہ یہ دلیل ہے اس

بات کی کہ اس کے دوسرے گوشوں میں بھی ناہمواریاں اور خرابیاں موجود ہیں۔

ہماری زندگی کے یہ تمام پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا بناؤ یا بگاڑ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

قرآن مجید کے تدبر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق صحیح طور پر اس صورت میں قائم ہوتا ہے جب ہم اپنے آپ کو خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت ہمارے دل، ہماری روح اور ہمارے ارادے سے ایک خاص مطالبہ کرتی ہے۔ اگر ہم یہ تمام مطلبے ٹھیک ٹھیک پورے کردیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اپنے رب کے ساتھ اپنے تعلق کو بالکل صحیح بنیاد پر قائم کرلیا۔ درحقیقت یہی تقاضے ہیں جن کی تفصیلات شریعت میں بیان ہوئی ہیں اور قرآن مجید میں اکثر احکام و ہدایات کے بیان کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کا جو حوالہ آتا ہے وہ درحقیقت اسی بات کو واضح کرنے کے لیے آتا ہے کہ یہ مطالبہ یا یہ ہدایت خدا کی فلاں صفت کا تقاضا ہے۔ جو شخص شریعت کے احکام وہدایات پر اس شعور کے ساتھ عمل کرتا ہے کہ فلاں حکم یا فلاں ہدایت کے اندر خدا کی فلاں صفت کا جلوہ ہے وہ شخص درحقیقت شریعت کی اصلی روح کو پہچانتا ہے۔ شریعت کے احکام پر جب وہ عمل کرتا ہے تو اس طرح عمل کرتا ہے کہ گویا وہ اس عمل کے اندر خدا کے جلوہ کو دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی یہ خدا کی بندگی اور اطاعت اس طرح کرتا ہے کہ گویا بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ بندہ کا خدا کو دیکھنا یہی ہے کہ شریعت کے ہر حکم کے اندر خدا کی صفات کا جو عکس ہے وہ اس کو نظر آتا ہے اور جب وہ عکس اس کو نظر آتا ہے تو وہ صاف یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندر خدا کی نگراں آنکھیں چھپی ہوئی ہیں جو اسے دیکھ رہی ہیں۔

قرآن مجید کی تلاوت کیجیے تو آپ کو ہر حکم اور ہدایت کے ساتھ خدا کی کسی نہ کسی صفت

کا حوالہ ضرور ملے گا۔ کہیں ایک بات فرمائی جائے گی اور اس کے ساتھ یہ آئے گا کہ خدا علیم وخبیر ہے۔ کہیں ایک بات کا حکم دیا جائے گا اور ارشاد ہو گا خدا علیم وحکیم ہے۔ کہیں کسی چیز سے روکا جائے گا اور اس کے ساتھ یہ تنبیہ ہوگی کہ خدا قوی و عزیز ہے۔

اس سے ایک طرف تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تمام دین وشریعت درحقیقت خدا کی صفات کا ایک مظاہرہ ہے، آدمی اگر اپنے آپ کو پوری طرح شریعت کے رنگ میں رنگ لے تو اس نے اپنے آپ کو صبغۃ اللہ میں رنگ لیا۔ اور دوسری بات یہ واضح ہوئی کہ شریعت کے احکام کی پابندی کا اصلی مزا صرف اس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو شریعت کے احکام کے اندر خدا کی صفات جمال وجلال کو دیکھ رہا ہو۔ جو لوگ اس جمال وجلال کے مشاہدے سے محروم رہتے ہیں ان کی دین داری بالکل رسمی اور رواجی دین داری ہوتی بھی ہے اس کے اندر اول تو پائداری نہیں ہوتی اور پائداری ہوتی بھی بھی ہے تو اس کے اندر روح اور زندگی نہیں ہوتی۔

ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ

یہاں ایک غلط فہمی سے آگاہ کر دینا نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بننا اور چیز ہے اور خدا کی صفات کا مظہر بننے کی کوشش کرنا ایک بالکل دوسری چیز ہے۔ شریعت انسان کا تعلق خدا کے ساتھ جو جوڑتی ہے اس میں اصل نصب العین اور مطمح نظر یہ ہے کہ بندہ اپنے ظاہر و باطن، دونوں میں خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بن جائے۔ شریعت میں بندے کے لیے کمال کا سب سے بڑا درجہ یہی ہے جو اکتساب اور جدوجہد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر کمال کا کوئی درجہ ہے تو وہ نبوّت کا درجہ ہے۔ لیکن وہ اکتسابی چیز نہیں، بلکہ وہبی ہے۔ اللہ ہی نے جس کو چاہا ہے یہ مرتبہ دیا ہے۔

لیکن جوگیوں اور راہبوں کے تصوف میں، بالخصوص اس تصوف میں جس کی بنیاد وحدت الوجود کے نظریہ پر ہے، مطمح نظر خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کا نہیں ہے، بلکہ خدا کی صفات کے مظہر بننے کا ہے۔ اس میں مجاہدہ اور ریاضت کا اصلی مقصود یہ نہیں ہوتا کہ آدمی عبدیت کا کمال درجہ حاصل کرلے، بلکہ سارا زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ آدمی خدا کی صفات کا اس طرح مظہر بن جائے کہ قطرہ دریا میں ضم ہو جائے اور دوئی اور تفرقہ کے سارے نشانات مٹ جائیں۔ ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

ظاہر ہے کہ یہ مطمح نظر شریعت کے مطمح نظر سے ایک بالکل مختلف مطمح نظر ہے۔ شریعت آدمی کو بندہ بنانا چاہتی ہے اور اس کا تزکیہ کا سارا جہاد اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ برعکس اس کے جوگیانہ تصوف میں آدمی اپنے آپ کو الٰہ بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی ساری ریاضت میں یہی غلط نقطۂ نظر کارفرما ہوتا ہے۔ اگر خدا کی شان تجرّد ہے تو اس راہ پر چلنے والے اپنے اندر تجرّد کی شان پیدا کرنا چاہیں گے۔ اگر خدا بے نیاز ہے تو یہ حضرات بھی بے نیاز بننے کی کوشش کریں گے۔ اگر خدا متصرّف ہے تو یہ بھی متصرّفِ ارواح و قلوب بننے کے لیے زور لگائیں گے۔ اگر خدا علیم و خبیر ہے تو یہ بھی غیب کے پردوں میں جھانکنے کے لیے طرح طرح کے چلّے اور مراقبے کریں گے۔ اگر خدا شافیٔ مطلق ہے تو یہ بھی چاہیں گے کہ ان کے ہاتھ لگانے اور ان کے چھو منتر سے بھی مریض شفا پائیں اور مردے جی اٹھیں۔ اگر خدا آگ اور پانی پر حکمران ہے تو یہ بھی پانی پر چلنا اور آگ سے کھیلنا چاہیں گے۔ یہاں تک کہ اس راہ پر چلنے والے لوگ اگر شریعت کی پابندیوں کو قبول بھی کرتے ہیں تو اپنے مذکورہ بالا مطمح نظر ہی کی خدمت کے نقطۂ نظر سے قبول کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ پابندیاں اس مطمح نظر تک پہنچنے کے لیے ایک زینے اور سہارے کا کام دیتی ہیں۔ بالآخر ان کے ہاں ایک وہ منزل بھی آتی ہے جہاں یہ ساری چیزیں

بندھن اور حجاب کے حکم میں داخل ہو جاتی ہیں اور حصولِ کمالِ مطلق کی راہ میں سبک روی کے لیے ان ساری پابندیوں سے آزاد ہو جانا ان کے ہاں ضروری ہو جاتا ہے۔

اسلام نے تعلق باللہ کے اس نقطۂ نظر کو بالکل غلط قرار دیا ہے۔ اس نے تعلق باللہ میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، جس اصول کی طرف رہنمائی کی ہے وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو صفاتِ الٰہی کے تقاضوں کے مطابق بنائے۔ مثلاً یہ کہ خدا منعم ہے تو بندہ کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کا شکر گزار بندہ بنے۔ خدا خالق ہے تو چاہیے کہ بندہ اسی کے امر و حکم کی اطاعت کرے۔ خدا سمیع و علیم ہے تو بندہ اسی سے مانگے اور اسی پر بھروسہ کرے۔ خدا قدوس ہے تو بندہ کو چاہیے کہ اپنے ظاہر و باطن، دونوں کو زیادہ سے زیادہ پاکیزہ بنائے۔ خدا عادل و طاقت ور ہے تو چاہیے کہ وہ ہر لمحہ اس سے ڈرتا رہے اور ظلم و ناانصافی کی ہر بات سے پرہیز کرے۔ غرض خدا کی ہر صفت بندے کو گوناگوں ذمہ داریوں اور بے شمار حقوق و فرائض کے بندھنوں میں باندھتی ہے اور بندہ خدا کی صفات اور ان کے عائد کردہ حقوق و فرائض کے علم و عمل کی راہ میں جتنا ہی بڑھتا جاتا ہے، اتنا ہی خدا سے اس کا قرب بھی بڑھتا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے اس کی ذمہ داریاں بھی مشکل تر اور نازک تر ہوتی جاتی ہیں۔

اصلی بحث سے پہلے یہاں یہ تنبیہ ہم نے اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ جوگیانہ تصوف کے بعض غلط اثرات اس تصوف میں بھی گھس گئے ہیں جس کو مسلمانوں نے اختیار کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض ذہنوں میں وہ غلط فہمی موجود ہو تو آدمی پر تزکیہ کے اس نظام کی اصلی قدر و قیمت واضح نہیں ہو سکتی جس کی طرف کتاب و سنت میں رہنمائی کی گئی ہے اور جس کے اصول و مبادی ہم واضح کرنا چاہتے ہیں۔

تصوف پر ہمارے متقدمین نے جو کتابیں تصنیف فرمائی ہیں ان میں سے بعض کتابوں کی قدر و قیمت کے ہم بہت قائل ہیں۔ لیکن ان کتابوں اور ان کے لائقِ احترام

مصنفین کے واجبی احترام کے باوجود دیانت داری کے ساتھ ہماری رائے یہ ہے کہ ان میں مقامات کی جو تشریح کی گئی ہے اس میں اکثر جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بات کتاب وسنّت کی حدود سے آگے نکل گئی ہے۔ ایک چیز کا جو اعلیٰ معیار وہ پیش کرتے ہیں اگر کتاب وسنت کی کسوٹی پر اس کو پرکھیے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ مقام کتاب وسنّت کے مقام سے ایک مافوق مقام ہے۔ یہاں تک کہ اگر اصل معیار اس کو مان لیجیے تو صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس معیار پر شاید ہی پورے اتر سکیں۔ اس چیز کا اثر طبیعت پر یا تو مایوسی کی شکل میں پڑتا ہے، آدمی یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ باتیں ہمارے دائرۂ جدّ و جہد سے باہر ہیں، یا پھر کتاب وسنّت سے اس کو یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ ان میں جو معیار پیش کیا گیا ہے، وہ صرف عام معیار ہے، عبدیت و انابت وغیرہ کا حقیقی معیار وہ ہے جو اہل تصوف پیش کرتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ہم ان اساسات کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا کہ ہمارا تعلق اس کے ساتھ قائم ہو اور جن پر ہم اپنا تعلق اس کے ساتھ قائم کر کے اپنے آپ کو اس کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنا سکتے ہیں۔

باب ۳

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق کی سب سے پہلی بنیاد شکر ہے۔ شکر کا تعلق دل سے بھی ہے، زبان سے بھی ہے اور عمل سے بھی ہے۔ دل کا شکر یہ ہے کہ کہ آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں، اس کے بے نہایت احسانات اور اس کے ان گنت انعامات کے احساس و اعتراف کے جذبہ سے اس طرح لبریز رہے جس طرح ایک دودھیل بکری کا تھن دودھ سے لبریز رہتا ہے۔ یہ تمثیل ہم نے محض تمثیل کے مقصد سے نہیں اختیار کی ہے، بلکہ لفظ شکر کی لغوی حقیقت بھی کچھ اس سے ملتی جلتی ہے۔ دل جب اللہ تعالیٰ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز رہتا ہے تو جس طرح ذرا سی حرکت سے ایک لبریز ساغر چھلک جایا کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ہر چھوٹی یا بڑی نعمت کی یاد اور اس کے مشاہدہ سے بندے کی زبان سے شکر کا کوئی کلمہ چھلک پڑتا ہے۔

جس شخص کا دل اس طرح خدا کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز رہے اس کا اثر لازمی طور پر اس کے اعمال پر بھی پڑتا ہے۔ اس کو ہر وہ عمل دل سے محبوب ہو جاتا ہے جس سے اس جذبے کو تسکین حاصل ہو سکے؛ اور اسی کے برابر اس کو ہر اس عمل سے نفرت ہو جاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی کسی ظاہری یا باطنی نعمت کی ناقدری ہو

رہی ہو۔ کسی نعمت کی قدر کا حقیقی احساس اگر آدمی کے اندر موجود ہو تو وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس نعمت کو اپنے حقیقی منعم ہی کے منشا کے خلاف استعمال کرے۔ اگر ایک کرم فرما ہمیں ایک ٹارچ عنایت کرے کہ ہم اس کی مدد سے اندھیرے کی ٹھوکروں سے بچ سکیں، ایک تلوار عنایت کرے کہ دشمن کے خطرات کی مدافعت کر سکیں، ایک سواری عنایت کرے کہ پیدل چلنے کی مشقت سے بچ سکیں تو کوئی انتہائی درجے کا کمینہ اور لئیم ہی ہوگا جو ان سارے اسباب و وسائل کو اسی کرم فرما کے گھر پر حملہ اور اسی کے زن و فرزند کو قتل کرنے میں استعمال کرے جس نے یہ اسباب و اسلحہ اس کو عنایت فرمائے۔ اسی طرح جس بندے کے اندر ان نعمتوں کا سچا احساس ہوتا ہے جو خدا نے اس کو عنایت کی ہیں، وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ ان نعمتوں کو وہ شیطان کی مقصد برآری میں صرف کرے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت عائشہؓ نے اپنے اس خط میں اشارہ فرمایا ہے، جو امیر معاویہؓ کو لکھا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ "جس شخص پر انعام ہوا ہو اس کے اوپر کم سے کم جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس انعام کو اسی کی نافرمانی کا ذریعہ نہ بنائے جس نے وہ انعام اس پر کیا ہے۔"

اس شکر کے جذبے کو صحیح طور پہ بیدار رکھنے کے لیے چند باتیں نہایت ضروری ہیں:

پہلی چیز تو یہ ہے کہ آدمی کو اس کے ظاہر اور باطن میں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ملی ہوئی ہیں ان کو برابر نگاہ میں رکھنے کی کوشش کرے۔ انسان کے اندر یہ بڑی کمزوری ہے کہ اگر وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو وہ تو اس کے ذہن پر چوبیس گھنٹے مسلط رہتی ہے اور ہر کسی سے اس کا ذکر کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں جو اس کو ہر وقت حاصل ہیں ان سے وہ اس طرح غافل و بے پروا رہتا ہے گویا ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اگر آدمی کو نعمتوں کے نعمت ہونے اور نعمتوں سے بہرہ یاب

ہونے کا کوئی احساس ہی نہ ہو تو وہ منعم کی قدر کیا کرے گا اور اس کے لیے اس کے اندر شکر و سپاس کا جذبہ کیا پیدا ہوگا۔ اس غفلت کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی روزانہ کوئی نہ کوئی وقت تھوڑا سا ایسا ضرور نکالے جس میں ان نعمتوں پر غور کرے جو اس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے ظاہر و باطن، دونوں میں بخشی ہیں، بلکہ ان کے مظاہر اس کائنات کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

تنہائی میں کبھی کبھی غور کرتے کرتے وہ اس پہلو سے بھی سوچے کہ بالفرض یہ نعمتیں اس کو نہ حاصل ہوتیں تو کیا ہوتا؟ یہ آنکھ جس سے وہ دیکھتا ہے اس سے وہ محروم ہوتا، یہ کان جس سے وہ سنتا ہے یہ بہرے ہوتے، یہ ہاتھ جن سے وہ زور آزمائی کرتا ہے شل ہوتے، یہ پاؤں جن سے وہ چلتا ہے مفلوج ہوتے تو اس کا حشر کیا ہوتا؟ اور پھر سب سے زیادہ اس بات پر دھیان کرے کہ یہ دماغ جس کی کارفرمائیوں پر وہ سب سے زیادہ نازاں ہے، خدانخواستہ یہ ماؤف ہوتا تو اس کی گت کیا بنتی؟

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ آدمی اس امر پر بھی ساتھ ہی ساتھ غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں ہمیں بخشی ہیں بلا کسی استحقاق کے بخشی ہیں۔ نہ ہمارا خدا پر کوئی حق قائم تھا نہ ہم نے کسی نعمت کا اس کو معاوضہ ادا کیا ہے اور نہ کسی نعمت کا معاوضہ ادا کر سکتے ہیں۔ پھر وہ جب چاہے اپنی ہر نعمت کو ہم سے چھین سکتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ آج آپ کو تختِ شاہی کی عظمتیں حاصل ہیں، کل وہ آپ کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی پکڑا دے تو آپ اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے کبھی بھی ذلت و مصیبت میں پڑے ہوئے آدمی کو نظر انداز کرتے ہوئے گزر جانے کی کوشش نہ کیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسی حالت میں مبتلا کر دیتا یا آئندہ کر دے تو آپ کو اس چیز سے کون بچا سکے گا۔ دنیا میں مصیبت زدہ سے مصیبت زدہ اور مفلوک سے مفلوک آدمی جو آپ نے دیکھا ہو، یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ ٹھیک اس کی جگہ پر آپ کو کھڑا

کر سکتا تھا اور اس کو آپ کی جگہ دے سکتا تھا، لیکن یہ اس کا فضل واحسان ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ آپ کو اس سے نہایت بہتر حالت میں رکھا۔

تیسری ضروری بات اپنے اندر شکرگزاری کا جذبہ بیدار رکھنے کے لیے یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ انہی لوگوں کو دیکھنے کی کوشش نہ کرے جو اپنے اسباب ووسائل اور اپنے حالات وذرائع کے اعتبار سے اس سے بہتر حالت میں ہوں، بلکہ ان لوگوں کو بھی سامنے رکھ کر اپنا موازنہ کرتا رہے جو ہر پہلو سے اس سے فروتر زندگی رکھتے ہیں۔ جو آدمی ہمیشہ اپنے سے بہتر حالات رکھنے والوں ہی پر نگاہ رکھتا ہے وہ ہمیشہ اپنی تقدیر سے شاکی اور اپنے رب سے بدگمان رہتا ہے۔ اس کے دل کو سچی خوشی کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر اس کو بہتر سے بہتر حالات بھی میسر آجائیں جب بھی اس کا دل آسودہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ درجہ تو اس کو بہرحال حاصل ہونے سے رہا کہ اس آسمان کے نیچے کوئی شخص کسی اعتبار سے بھی اس سے بہتر حالت میں نہ رہے۔ اس وجہ سے خدا کی شکرگزاری کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ آدمی ان لوگوں کے حالات پر نگاہ ڈالے جو اسی خدا کے بندے ہیں جس کا بندہ وہ ہے، لیکن ان لوگوں کو ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی حاصل نہیں ہے جو اس کو بڑی وسعت کے ساتھ حاصل ہیں۔

حضرت سعدیؒ کی ایک حکایت اس حقیقت کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنی سیر وسیاحت کے سلسلے میں وہ دمشق یا کسی اور شہر میں جب پہنچے تو ان کی جوتی پھٹ چکی تھی اور ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ نئی جوتی خرید سکیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنی اس غربت کے سبب سے میں دل میں نہایت ملول تھا اور بار بار یہ خیال ذہن میں پیدا ہو رہا تھا کہ اس فضل وکمال کے باوجود خدا نے مجھے اس حال میں رکھا ہے کہ میرے پاؤں میں جوتی بھی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں اسی دل گرفتگی کے ساتھ شہر کی مسجد میں داخل ہوا۔ وہاں پہنچا

تو میری نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جس کے سرے سے پاؤں ہی نہیں تھے. اس کو دیکھتے ہی میں دفعتاً اپنے رب کے آگے سجدے میں گر پڑا کہ اس کا لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے جوتی نہیں تو پاؤں تو دیے ہیں، یہ بے چارہ تو سرے سے پاؤں ہی سے محروم ہے۔

حضرت سعدیؒ نے اپنی اس سرگزشت میں نہایت خوبی کے ساتھ یہ بات سمجھا دی ہے کہ خدا کا شکرگزار بندہ بننے کے لیے دنیا کو کس نگاہ سے دیکھنا ضروری ہے۔ جو لوگ دنیا کو سعدیؒ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کو قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی وہ نشانیاں ملتی رہتی ہیں جو ان کو خدا کے شکر پر ابھارتی رہتی ہیں۔ لیکن جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ کتنوں کے پاس پاؤں ہی نہیں ہیں، اپنی اس محرومی پر خدا سے شاکی رہتے ہیں، کہ ان کے پاس کار نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی خدا کی شکرگزاری کی توفیق نہیں پاتے۔

باب ۴

عبادت

خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری بنیاد عبادت ہے۔ بندے کے اندر جب اپنے منعمِ حقیقی کے لیے شکر کا جذبہ پیدا ہوا تو یہ جذبہ قدرتی طور پر منعم کے لیے اظہارِ احسان مندی، اظہارِ نیازمندی اور اظہارِ تذلل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کی فطرت کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اپنے منعم و محسن کے لیے، اس کی طرف سے آپ سے آپ، یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ انسان تو انسان حیوانات تک کی جبلت کا بھی یہی حال ہے۔ کتے، بلی، گھوڑے، گدھے، جس کی بھی آپ پرورش کیجیے اور جس پر بھی کوئی احسان کیجیے ناممکن ہے کہ وہ آپ کو دیکھیں اور آپ کے سامنے اپنی نیازمندی اور اپنی ممنونیت کا اظہار نہ کریں۔ یہ ممنونیت ان کی آواز، ان کی حرکات اور ان کی صورت و ہیئت، ہر چیز سے ظاہر ہوتی ہے۔

یہ چیز انسان کی فطرت کے اندر حیوانات کی جبلت کے لحاظ سے زیادہ نمایاں ہے اور زیادہ نمایاں ہونی چاہیے بھی۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ جس کا بھی ہم پر کسی طرح کا کوئی احسان ہوتا ہے، ہم اس کے احسان پر اپنی ممنونیت کا اظہار اپنی زبان سے بھی کرتے ہیں اور اپنی صورت و ہیئت سے بھی۔ جو لوگ محسن کے احسان کا یہ حق ادا نہیں کرتے وہ ہمارے اندر کمینے اور نا احسان شناس سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارا یہ رویہ

اپنے عام محسنوں کے ساتھ ہوتا ہے یا ہونا چاہیے اور یہی رویہ فطرتِ انسانی کا حقیقی تقاضا ہے۔ پھر اسی سے اندازہ کیجیے کہ اس ذات کے انعامات و احسانات کے مقابل میں ہمارا کیا رویّہ ہونا چاہیے جو نہ صرف تمام انعامات و احسانات ہی کا منبع ہے، بلکہ خود ہمارے وجود کا سرچشمہ بھی ہے اور جس کے انعامات و احسانات عارضی اور وقتی نہیں ہیں، بلکہ دائمی اور ابدی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے حقیقی محسن و مربّی کے لیے بندہ اپنی کامل نیازمندی اور کامل بندگی کا اظہار کرنا چاہے گا۔ اگر اس نے اپنی فطرت میں کوئی خرابی نہیں پیدا کرلی ہے تو یہ چیز عین اس کی فطرت کا مطالبہ ہے جس کو پورا کیے بغیر وہ دل کا اطمینان اور روح کا سکون حاصل ہی نہیں کر سکے گا۔ اگر کسی کے اندر یہ چیز ظاہر نہ ہو رہی ہو تو غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے دل کے اوپر یا تو غفلت کا حجاب ہے یا حماقت کا۔ غفلت کی حقیقت تو اس سلسلہ مباحث میں مختلف مواقع پر ظاہر کی جا چکی، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، رہی حماقت تو اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ بہت سے لوگ ان اسباب و وسائط ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں جو ان کے حقیقی منعم کے درمیان حائل ہوتے ہیں۔ حقیقی منعم کا یا تو ان کو کوئی خیال ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو بالکل ضمنی اور محض سرسری طور پر۔

اسی اظہارِ ممنونیت و نیازمندی اور اسی اظہارِ تذلّل کو عبادت کہتے ہیں۔ یہ اظہار زبان، حرکات اور صورت و ہیئت ہر چیز سے ہوتا ہے۔ جب تک ہر چیز سے یہ اظہار نہ ہو اس کی اصلی حقیقت وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے آدمی کی عبادت کی تکمیل میں اس کی ہر چیز کسی نہ کسی نوعیت سے شریک ہوتی ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس کے جتنے بھی اعضاء و جوارح ہیں سب اس میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح اس کے اندر جتنی بھی عقلی و روحانی قابلیتیں ہیں سب اس میں اپنا نذرانہ پیش کرتی ہیں، بلکہ اس کی حقیقی تکمیل ہوتی ہی اس وقت ہے جب آدمی اپنے ان وسائل

ذرائع کو بھی اس کام میں شریک کرے جن سے وہ اس دنیا میں اپنی ضروریات، اپنی خواہشوں اور منصوبوں کی تکمیل کرتا ہے۔

یہ بات کچھ زیادہ دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ خدا کی عبادت درحقیقت اس جذبۂ شکرگزاری کا مظہر ہے جو اپنے منعمِ حقیقی کے لیے بندے کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ واضح ثبوت سورۂ فاتحہ ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے شکر کی سورہ ہے اور اس کو اسلام کی سب سے بڑی عبادت —— نماز —— کی خاص سورہ قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں فاتحہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے پر خدا کی ربوبیت اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت کی شانوں کے مشاہدے سے شکرگزاری کا جو جذبہ طاری ہوتا ہے اس کا پہلا تقاضا جو اس کی زندگی میں نمایاں ہوتا ہے وہ 'اِیَّاكَ نَعْبُدُ' (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں) کا اقرار ہے۔

قرآن مجید کے دوسرے مواقع سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی عبادت درحقیقت خدا کی شکرگزاری ہی کی عملی صورت ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝	بلکہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرو اور اسی کے شکرگزاروں میں سے بنو۔
(الزمر - ۳۹ : ۶۶)	

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ	اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کے شکرگزار بنو۔
(العنکبوت - ۲۹ : ۱۷)	

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق روایات میں آتا ہے کہ آپ رات میں نمازوں میں اتنی اتنی دیر تک قیام فرماتے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج جاتے۔ ایک روایت ملاحظہ ہو:

قالت عائشة : يارسول الله[1]	حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے
أتصنع هذا وقد غفر لك	پوچھا: یارسول اللہ! جب آپ کے
ما تقدم من ذنبك وما	تمام اگلے اور پچھلے گناہ بخشے جاچکے
تأخر؟ فقال: ياعائشة!	ہیں تو آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے
أفلا أكون عبدا	ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ عائشہ! کیا میں یہ بات
شكوراً[1]؟	نہ چاہوں کہ خدا کا شکرگزار بندہ بنوں؟

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ عبادات میں اصل محرک خدا کی شکرگزاری کا احساس اور جذبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگر ہمیں اپنی عبادات کا حکم دیا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کو یہ بات پسند آئی کہ وہ ہمیں کسی مشقت اور زحمت میں مبتلا کرے بلکہ اس نے یہ پسند فرمایا کہ ہمارے جذبۂ شکرگزاری کے اظہار کے لیے ایسی شکلیں معین فرمائے جو اس کی نگاہوں میں پسندیدہ اور ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ نافع اور موجب خیر و برکت ہیں۔

عبادت کی اس روح کے لحاظ سے حقیقی عبادت وہی ہے جو خدا کی شکرگزاری کے سچے جذبے کے ساتھ ادا کی جائے۔ اگر کوئی عبادت اس جذبے سے خالی ہو، آدمی اس کو ایک بار اور ایک مصیبت سمجھ کر کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرے تو یہ عبادت وہ عبادت نہیں جو خدا کے ہاں قبولیت کا درجہ حاصل کرے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ بندہ خدا کی عبادت کر کے درحقیقت وہ سب سے بڑا حق ادا کرتا ہے جو اس کے خالق و مالک اور منعم و محسن پروردگار کا اس کے اوپر عائد ہوتا ہے اور یہ حق وہ اس لیے ادا نہیں کرتا کہ اس میں اس کے خالق و

---

[1] صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین واحکامهم: باب ۱۸

مالک کا کوئی نفع ہے، بلکہ محض اس لیے ادا کرتا ہے کہ اس میں خود اس کا اپنا سراسر نفع ہے
اس طرح وہ اپنے آپ کو ان انعامات کا مزید سزاوار بناتا ہے جو اس کو اس کے رب
کی جانب سے بلا کسی استحقاق کے حاصل ہیں۔ قرآن مجید کی متعدد آیات سے یہ حقیقت
واضح ہوتی ہے کہ خدا کی عبادت درحقیقت اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ خالق ہے،
مالک ہے، مربّی ہے، پروردگار ہے، نہ اس لیے کہ اس کے کرنے سے
خدا کو کوئی نفع پہنچتا ہے یا نہ کرنے سے اس کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ پھر انسان جو بھی
قدم اٹھائے گا غالب یہی ہے کہ وہ غلط اٹھائے گا اور جتنا ہی آگے بڑھتا جائے گا۔
وہ خدا کی راہ سے دور اور شیطان کی ٹھہرائی ہوئی منزلِ مقصود سے قریب تر ہوتا جائے گا۔

باب ۵

اطاعت

عبادت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو استوار رکھنے کے لیے اس کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ اسلام میں ہندوئیت اور عیسائیت کی طرح خدا صرف پوجا پاٹ ہی کا حق دار نہیں ہے، بلکہ اطاعت اور فرمانبرداری کا بھی حق دار ہے۔ اطاعت سے مطلب ان قوانین و احکام کی اطاعت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے اپنے بندوں کی انفرادی زندگی کی درستگی اور ان کی اجتماعی زندگی کی تنظیم کے لیے اتارے ہیں۔

اس اطاعت کے لیے سب سے پہلے تو عقل مطالبہ کرتی ہے کیونکہ یہ بات بالبداہت عقل کے خلاف ہے کہ انسان جس ہستی کو اپنی عبادت کا مستحق تسلیم کرے اس کے احکام و قوانین کی اطاعت سے بے پروا رہے یا ان کا انکار کرے۔ اگر معبود ہستی نے کوئی حکم اور قانون دیا ہی نہ ہو (جس کا معبود حقیقی کے بارے میں تصور نہیں کیا جا سکتا) تب تو اور بات ہے، لیکن اس معبود ہستی نے اگر کچھ احکام و قوانین دیے ہیں تو انسان کی عقل اس سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جس کو عبادت کا مستحق سمجھتا ہے اسی کو اطاعت کا بھی مستحق سمجھے۔ عبادت کسی کی کرنا اور اطاعت کسی اور کی کرنا دونوں باتوں میں ایک کھلا ہوا تضاد ہے، جس پر صرف وہی شخص مطمئن ہو سکتا ہے جس

کی عقل میں بہت بڑا فتور واقع ہوگیا ہو۔

دوسرے درجہ میں اس کا مطالبہ، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اسلام کی ظاہری شکل وصورت کرتی ہے۔ اسلام کو جو شخص تھوڑا بہت جانتا ہے وہ اس حقیقت سے کسی طرح بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ اسلام کے خدا نے صرف اپنی پرستش ہی کا مطالبہ نہیں کیا ہے، بلکہ اپنی اطاعت کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ اس نے لوگوں کو نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور زکوٰۃ دینے ہی کے احکام نہیں دیے، بلکہ معاملات، کاروبار، زراعت، تجارت، سیاست سے متعلق بھی بہت سے واضح اور قطعی احکام وقوانین دیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام وقوانین اس نے اسی لیے دیے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے، اگر ان کی اطاعت مطلوب نہیں ہے تو پھر ان احکام کے دینے کا فائدہ ہی کیا؟ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ (المآئدۃ۔ ۵: ۴۴)	اور جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں تو یہی لوگ کافر ہیں۔
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ (المآئدۃ ـ ۵: ۴۵)	اور جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں گے تو وہی لوگ ہیں جو ظالم ٹھہریں گے۔
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ (المآئدۃ۔ ۵: ۴۷)	اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں گے تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔

اسی وجہ سے قرآن مجید میں صرف اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ہی کا حکم نہیں آیا

ہے، بلکہ بار بار 'اَطِیۡعُوا اللّٰہَ' کا حکم بھی آیا ہے جس کے معنی یہی ہیں کہ اللہ کے قانون کی اطاعت کرو:

قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡکٰفِرِیۡنَ ۝	کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

(آل عمران - ۳ : ۳۲)

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ	اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر کی۔

(النسآء - ۴ : ۵۹)

اس اطاعت کی عملی شکل درحقیقت رسول کی اطاعت ہے اس لیے کہ رسول ہی ہے جو خدا کے نائب کی حیثیت سے خدا کے احکام و قوانین سے باخبر کرتا اور ان کی تنفیذ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی 'اَطِیۡعُوا اللّٰہَ' وارد ہے، ساتھ ہی 'اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ' کا بھی حکم ہے۔ اس وجہ سے خدا اور رسول کے درمیان فرق کرنے کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن رسول کی اطاعت تسلیم نہیں کرتے ان کی مثال بالکل ایسی ہے کہ وہ بادشاہ کی اطاعت تو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کے مقرر کیے ہوئے نائب کی اطاعت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی خود مختاری کی گنجائش نہ تو دنیا کے قوانین میں کہیں تسلیم کی گئی ہے اور نہ خدا ہی نے اپنے قانون میں اس کے جواز کی کوئی گنجائش رکھی ہے:

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی	پس نہیں، تیرے رب کی قسم، یہ لوگ

يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ	مومن نہیں ہیں جب تک اپنی
ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ	نزاعات میں تمہی کو حکم نہ مانیں اور جو
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ	کچھ تم فیصلہ کر دو اس پر اپنے دلوں میں
يُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝	کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے
(النساء - ۴ : ۶۵)	سرِ تسلیم خم نہ کر دیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس اطاعت سے دو شکلوں کے سوا کسی شکل میں بھی انحراف کی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ ایک بھول چوک یا کسی جذبہ سے مغلوبیت، دوسرے مجبوری۔ پہلی صورت کا علاج استغفار اور توبہ اس نے بتایا ہے اور دوسری صورت کا علاج امکان کے حد تک، اس مجبوری کی اصلاح یا اس سے نکلنے کی جدّ و جہد۔ ان شکلوں کے سوا خدا کی اطاعت سے انحراف اختیار کرنے والا اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق ہی منقطع کر لیتا ہے۔

مسلمان جہاں کہیں بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ وہ خدا کے قانون کا نفاذ کر سکیں ان کے اوپر یہ واجب ہے کہ وہ خدا ہی کے قانون کو نافذ کریں اور اسی کی اطاعت کریں جو نظامِ خدا اور رسول کے قانون پر مبنی ہو اور خدا اور رسول کے احکام ہی کے نفاذ کے لیے وجود میں آیا ہو اسلام میں اس کا درجہ بہت اونچا ہے۔ اس نظام کے چلانے والے اولوالامر درحقیقت رسول کے خلفاء کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے ان کی اطاعت واجب ہے۔ اوپر ہم نے سورۂ نساء والی آیت جو نقل کی ہے اس میں اولوالامر سے ایسے ہی اولوالامر مراد ہیں۔ ایسے اولوالامر کی اطاعت سے اگر کوئی شخص انحراف اختیار کرے تو وہ گویا خدا اور رسول کی اطاعت سے انحراف اختیار کرتا ہے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو:

عن ابی هريرة، قال : قال	حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
من اطاعنی فقد	جس نے میری اطاعت کی اس نے
اطاع اللہ، ومن اطاع الامام	اللہ کی اطاعت کی اور جس نے صاحبِ امر
فقد اطاعنی - ومن	کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت
عصانی فقد عصی اللہ،	کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے
ومن عصی الامام فقد	اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے صاحبِ امر
عصانی[1]	کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی

اس حدیث سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خدا کی اطاعت کے لیے رسول کی اطاعت کے لیے اسلامی نظام کے صاحبِ امر کی اطاعت شرط لازم ہے جس نے رسول کی اطاعت نہیں کی، اس نے خدا کی اطاعت نہیں کی اور جس نے صاحبِ امر کی اطاعت نہیں کی وہ رسول کی اطاعت سے محروم رہا۔

اسلامی نظامِ اطاعت کی یہ تینوں کڑیاں ایک دوسری سے الگ نہیں کی جا سکتی ہیں۔ یہ تینوں درحقیقت ظاہر میں تین ہیں اور الگ الگ نظر آتی ہیں، حقیقت میں یہ تینوں ایک ہی ہیں کیونکہ مقصود بالذات تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، بقیہ دونوں تو اس کا وسیلہ و ذریعہ ہیں۔

اسلام نے اپنے نظامِ اطاعت میں اولوالامر کو یہ بلند منصب جو دیا ہے تو اس منصب کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ خود خدا کے قانون کی اطاعت کریں اور اس کے بندوں کے اندر اسی کے قانون کو جاری و نافذ کریں جس طرح رسول کو یہ بات دل وجان سے زیادہ عزیز و محبوب تھی کہ لوگ خدا کے قانون کی اطاعت کریں اسی طرح انہیں

---

[1] سنن ابن ماجۃ: کتاب الجہاد، باب ۳۹

بھی یہ بات محبوب ہو کہ لوگ خدا اور رسول کے احکام کی اطاعت کریں اور جس طرح رسول کے نزدیک یہ چیز مبغوض تھی کہ لوگ اللہ کی اطاعت سے انحراف اختیار کریں اسی طرح ان کے نزدیک بھی یہ چیز مبغوض ہو کہ لوگ خدا اور رسول کی اطاعت سے انحراف اختیار کریں۔

اسی طرح کے منصب کا ایک بدیہی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ نہ تو خود خدا کے قانون کی نافرمانی کریں اور نہ دوسروں کو کسی ایسی بات کا حکم دیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں سے اطاعت کا یہ مطالبہ اس بنیاد پر ہے کہ اس کائنات کا حقیقی حکمران وہی ہے۔ بندوں کا حقیقی منصب صرف اطاعت کا ہے اور اگر وہ کوئی تصرف کا حق رکھتے ہیں تو صرف اس کے نائب کی حیثیت سے۔ اس وجہ سے ان کے لیے یہ بات کسی حال میں جائز نہیں ہے کہ وہ اصل حکمران کے حکم کے خلاف کوئی حکم دیں اور اگر وہ ایسا کر بیٹھیں تو وہ اپنا وہ درجہ از خود ختم کر دیتے ہیں جو اسلام نے ان کو بخشا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام سخت بھی ہیں اور نرم بھی۔ ان پر عمل کرنے اور عمل کرانے میں بسا اوقات نہایت مشکل حالات اور صبر آزما رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا مطالبہ بندوں سے یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات میں اسی کی اطاعت کریں۔ جو لوگ صرف انہی باتوں میں خدا کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں جن کو وہ اپنی خواہشوں یا مصلحتوں کے مطابق پاتے ہیں، جن باتوں کو وہ اپنی خواہشوں اور مصلحتوں کے مطابق نہیں پاتے ان کی اطاعت سے گریز کی راہیں نکالتے ہیں یا ان میں تحریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمایا ہے، بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے غضب اور اپنی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔ پچھلی امتوں میں اس کی مثال یہود ہیں۔ یہود نے اللہ تعالیٰ کی شریعت کی بہت سی باتیں اپنی

خواہشات اور اپنے مصالح کے خلاف سمجھ کر بدل ڈالیں۔ انہوں نے اپنے گمان کے
مطابق خدا کی شریعت کو زمانے کے حالات کے مطابق ایک ترقی یافتہ شریعت
کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت میں اُن کی اِن
اصلاحات کو نہ صرف یہ کہ قبول نہیں فرمایا، بلکہ ان کی اس جسارت کی پاداش میں
ان کو اپنی شریعت ہی سے محروم کر دیا اور ان پر لعنت کر دی۔

اخلاص

عبادت ہو یا اطاعت، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان میں سے قبولیت صرف اسی عمل کو حاصل ہوتی ہے جس میں اخلاص ہو۔ اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جائے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہی حاصل کرنے کے لیے کیا جائے، اس مقصد کے سوا کسی اور غرض کا اس میں شائبہ نہ ہو۔

لوگوں نے اس کی تعریف اگرچہ مختلف الفاظ میں کی ہے لیکن یہ اختلاف محض الفاظ کا ہے، مدّعا سب کا ایک ہی ہے۔ ایک عارف نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ اطاعت میں مقصود صرف اللہ وحدہٗ کی ذات ہو۔ ایک اور بزرگ نے فرمایا کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی اپنے عمل کو مخلوق کے خیال و لحاظ سے بالکل بالاتر رکھے۔ ایک اور عارف کا قول ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی کے اعمال ظاہر و باطن، دونوں میں بالکل یکساں ہوں۔ اسی طرح ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی کی توجہ اس طرح خدا کی طرف ہو جائے کہ وہ اپنے عمل میں خلق کے لحاظ و خیال سے بالا ہو جائے۔ فضیل کا قول ہے کہ لوگوں کے خیال سے عمل کو چھوڑنا ریا ہے، کرنا شرک ہے، اخلاص یہ ہے کہ آدمی ان دونوں فتنوں سے محفوظ رہے[1]۔

---

[1] یہ اقوال مدارج السالکین لابن قیم سے ماخوذ ہیں۔

احادیث سے بھی اخلاص کی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے:

عن عمر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الاعمال بالنيّة ولكل امرئ مانوى. فمن كانت هجرته الى الله ورسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرته لدنيا يصيبها او امرأة يتزوّجها فهجرته الى ما هاجر اليه۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اعمال کا انحصار نیتوں پہ ہے۔ ہر آدمی کے سامنے اُس کی نیت ہی آئے گی۔ جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے شمار ہوگی۔ اور جس کی ہجرت کسی دنیوی مقصد کے لیے ہوگی جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی عورت کی خاطر ہوگی جس سے وہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لیے ہے۔

عن ابی موسیٰ قال: سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الرجل يقاتل شجاعةً ويقاتل حميّةً ويقاتل رياءً اىّ ذالك فى سبيل

ابو موسیٰ عبداللہ بن قیس اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ ایک شخص اپنی بہادری کی نمائش کے لیے جنگ کرتا ہے، ایک شخص مجرد حمیت کے تحت جنگ کرتا ہے، ایک شخص محض دکھاوے کے لیے

---

۱ صحیح البخاری: کتاب الایمان، باب ۴۱

الله؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من قاتل لتكون كلمة الله هى العليا فهو فى سبيل الله۔[1]	جنگ کرتا ہے، ان میں سے کس کی جنگ اللہ کی راہ میں ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے راستہ میں اس شخص کی جنگ ہے جو اس مقصد کے لیے جنگ کرے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔

اسی طرح ایک اور مشہور حدیث ہے جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ سب سے پہلے تین قسم کے لوگوں پر دوزخ کی آگ بھڑکائی جائے گی۔ ایک قرآن کے وہ قاری جو قاری کہلانے کے لیے قرآن پڑھتے ہیں، دوسرے وہ مجاہد جو بہادر کہلانے کے لیے جہاد کرتے ہیں، تیسرے وہ صدقہ کرنے والے جو اس لیے صدقہ کرتے ہیں کہ لوگوں میں ان کی داد و دہش کی دھوم ہو۔[2]

جو حقیقت ان احادیث میں واضح کی گئی ہے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اخلاص کی یہی اہمیت و حقیقت قرآن مجید میں بھی بیان ہوئی ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ (البیّنة - ۹۸ : ۵)	ان کو یہی حکم ہوا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ بالکل یک سو ہو کر۔
فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۙ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ (الزمر - ۳۹ : ۲)	تو تم اللہ ہی کی بندگی کرو، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ۔ یاد رکھو کہ اطاعت خالص کا سزاوار اللہ ہی ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب ۴۲

[2] صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب ۴۳

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا گیا ہے:

قُلِ اللّٰہَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّہٗ دِیْنِیْ ۙ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ ؕ

کہہ دو کہ میں تو اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ۔ سو تم اس کے سوا جس کی چاہو بندگی کرو۔

(الزمر - ۳۹: ۱۴-۱۵)

تمام عبادات و اطاعت کی روح اسی اخلاص کو قرار دیا گیا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

کہہ دو میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں تم میں پہلا مسلم ہوں۔

(الانعام - ۶: ۱۶۱-۱۶۲)

اس اخلاص کے لیے جہاں یہ بات ضروری ہے کہ آدمی کا عمل صرف اللہ کے لیے ہو وہیں یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس کا عمل خدا کے حکم اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق ہو۔ یہ چیز اخلاص کی فطرت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص کوئی کام نہایت اخلاص کے ساتھ خدا ہی کے لیے کرے، لیکن اس کا وہ کام خدا اور رسول کے حکم کے خلاف ہو تو اس کا یہ اخلاص بے معنی، بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی توہین ہے۔ اس کا طرزِ عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا کی پسند و ناپسند کو خود خدا اور رسول سے زیادہ سمجھنے کا زعم رکھتا ہے اور یہ زعم غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ گھمنڈ اور شرک، دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اس وجہ سے کوئی عمل جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف ہو، وہ اخلاص کا عمل نہیں قرار پا سکتا، اگرچہ وہ کتنے ہی مخلصانہ طور پر انجام دیا جائے۔

فضیل بن عیاض کا ایک قول سننے اور سمجھنے کے قابل ہے۔ ان سے بہترین عمل کی حقیقت پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ بہترین عمل یہ ہے کہ وہ خالص اور بے لوث بھی ہو اور درست بھی۔ جب اس کی مزید تشریح ان سے چاہی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر عمل درست ہو، لیکن خالص نہ ہو جب بھی وہ قبول نہیں ہوتا۔ خدا کے ہاں قبول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عمل خالص بھی ہو اور درست بھی۔ پھر انہوں نے خالص کی یہ تشریح فرمائی کہ وہ صرف اللہ کے لیے ہو۔ اور درست کی یہ تشریح فرمائی کہ وہ سنت کے مطابق ہو۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں چند آیتیں پڑھیں۔

اگر کوئی عمل خدا اور رسول کے حکم کے خلاف مجرد اخلاص کی بنا پر خدا کے ہاں قبولیت کا درجہ حاصل کر سکتا تو رہبانیت کا نظام اللہ تعالیٰ کے ہاں ضرور قبولیت کا درجہ پاتا، اس لیے کہ جن لوگوں نے اس نظام کو ایجاد کیا، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کے اخلاص کا حوالہ دیا ہے، لیکن ان کے اس اخلاص کے حوالہ کے باوجود ان کی اس ایجاد کو بدعت اور باطل قرار دیا۔

بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکتی ہے کہ اگر ایک آدمی بھلائی کے کام کرے، لیکن وہ اللہ کے لیے نہ کرے یا اللہ کے ساتھ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرے تو آخر اس کے وہ عمل خدا کے ہاں قبولیت سے کیوں محروم رہتے ہیں، کام تو اس کے وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ قرار دیے گئے ہیں؟ جن لوگوں کو یہ بات کھٹکتی ہے وہ دین کی ایک بنیادی حقیقت سے بے خبر ہیں وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اچھائی اور بھلائی کے کاموں کا محتاج نہیں ہے کہ جو لوگ بھلائی کا کوئی کام کردیں خواہ وہ اس کے لیے کریں یا کسی اور کے لیے، خواہ وہ اس عمل کو اس کے حکم کے مطابق کریں یا اس کے خلاف، وہ ان کا ممنونِ کرم ہو جائے کہ ان لوگوں نے اس پر یا اس کی دنیا پر کوئی احسان کر دیا ہے، اس وجہ سے اس پر لازم ہو گیا ہے کہ وہ ان کی بھلائیوں کی

قدر کرے اور ان کا بدلہ دے۔

اللہ تعالیٰ کسی کی نیکی اور بدی دونوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنی ساری دنیا کو صرف فرشتوں ہی سے بھر دے، اس کے اندر کوئی برائی کرنے والا سرے سے رہ ہی نہ جائے۔ اسی طرح اگر وہ چاہے تو ہر آدمی کو اتنا نیک بنا دے کہ اس سے کسی شر کا صدور سرے سے ہو ہی نہیں۔ لیکن اختیار اور قدرت کے باوجود اس نے ایسا نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو صرف نیکی اور بھلائی ہی مطلوب نہیں ہے، بلکہ اصل چیز جو مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ لوگ بھلائی کے کام صرف اس کی رضا کے لیے کریں اور اس کے حکموں کے مطابق کریں۔ اس وجہ سے جو نیکی مذکورہ شرطوں کے ساتھ کی جاتی ہے اس کی تو اس کے ہاں بڑی قدر ہے، خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہو اور وہ اس کا اجر دیتا ہے، لیکن جس نیکی میں کسی اور شائبہ کی ملاوٹ ہو جاتی ہے، اس کا اس کے ہاں کوئی اجر نہیں ہے۔ وہ اس طرح کی نیکی کرنے والوں سے کہتا ہے کہ اس کا اجر اس سے لو جس کے لیے تم نے یہ نیکی کی ہے۔ احادیث میں یہی حقیقت اس طرح واضح کی گئی ہے۔ ایک حدیثِ قدسی ہے:

انا اغنی الشرکاء عن الشرک۔ فمن عمل لی عملاً اشرک فیہ غیری فانا منہ بری، وھو للذی اشرک[1]۔	میں ساجھے کے تمام شریکوں سے زیادہ بے نیاز ہوں۔ پس جس نے میرے لیے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ اس نے کسی دوسرے کو بھی شریک کر لیا تو میں اس سے بری ہو جاتا ہوں اور وہ عمل اسی کے لیے ہو جاتا ہے جس کو اس نے میرے ساتھ شریک کیا۔

---

[1] سنن ابن ماجہ: کتاب الزھد، باب ۲۱

جب آخرت میں ایسے لوگ اجر کے طالب ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ:

اذھب، فخذ اجرك	جاؤ اس سے تم اپنے عمل کا معاوضہ لو
ممن عملت لہ۔ لا	جس کے لیے تم نے یہ کام کیا ہے۔ ہمارے
اجر لك عندنا۔	ہاں تمہارے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔

یہ شریک، کوئی بت اور صنم بھی ہو سکتا ہے، خاندان اور قبیلہ بھی ہو سکتا ہے، قوم اور وطن بھی ہو سکتے ہیں، شہرت، دکھاوے اور نفس کی دوسری خواہشیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے جو چیز بھی ہو وہ اخلاص کی ضد ہے اور وہ انسان کے عمل کو عنداللہ باطل کر دیتی ہے۔

اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ کوئی مخلص مسلمان اپنے خاندان یا قبیلہ، قوم اور وطن کے لیے کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے خاندان اور قبیلہ، قوم اور وطن کے حقوق و فرائض خود نہایت تفصیل کے ساتھ متعین کر دیے ہیں اور ہر مسلمان پر یہ واجب کر دیا ہے کہ ہر شخص ان حقوق و فرائض کو اللہ کی رضا کے لیے اور اس کے احکام کے مطابق ادا کرے۔ جو شخص ان حقوق و فرائض کو اللہ کی رضا کے لیے اور اس کے احکام کے مطابق ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بڑا اجر ہے اور اس کا وہ کام خدا کے لیے نہ ہو تو وہ نری دنیا داری ہے، اگرچہ وہ، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، بظاہر جہاد ہی کیوں نہ ہو۔

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس اخلاص کے ہونے یا نہ ہونے سے عمل کی فطرت میں بڑا تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ فرض کیجیے ایک ماں کی ممتا بچے کے لیے ہر شبہ سے بالاتر چیز ہے، لیکن اگر وہ اپنی ممتا کے جوش میں یہ کرے کہ بچے کی بیماری میں اس کو وہ سب کچھ کھلاتی جائے جس کے لیے بچہ ضد کرے، ڈاکٹر کی ہدایات کی وہ کوئی پروا نہ کرے تو اس ممتا کے باوجود اندیشہ ہے کہ وہ بچے کی جان لے کے رہے گی

اسی طرح فرض کیجیے ، ایک شخص ہے جو کام تو اچھے کرتا ہے لیکن ان کاموں میں اس کے سامنے صرف خدا ہی کی رضا جوئی کا نصب العین نہیں ہے ، بلکہ خدا کے سوا کوئی اور نصب العین ہے تو لازمی طور پر وہی نصب العین اس کے لیے حق اور باطل ، پسند اور ناپسند ، خیر اور شر کے لیے معیار بن جائے گا۔ آگے چل کر یہ چیز اس کی ہر بھلائی کو برائی کی شکل میں تبدیل کر دے گی۔ وہ اپنے قبیلہ اور اپنی قوم کے لیے اچھے اچھے کام کرتے کرتے بالآخر اس فلسفہ تک پہنچ سکتا ہے کہ "میری قوم ، خواہ حق پر ہو ، یا باطل پر" یہ فلسفہ بالآخر اس کو ہٹلر اور مسولینی بنا دے سکتا ہے۔ یہ صرف خدا کی رضا جوئی کے نصب العین ہی کا خاصا ہے کہ وہ انسان کو کبھی بھٹکنے نہیں دیتا۔ یہ نصب العین انسان کو ایک جہانی اور آفاقی نقطۂ نگاہ دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس کے سامنے ہمیشہ اپنی ذات ، اپنی قوم اور اپنے ملک کی بہبود کے ساتھ ساتھ انسانیت کی خدمت کا ہمہ گیر پروگرام رہتا ہے۔

اسی وجہ سے اسلام میں خدا کے سوا کسی اور چیز کو پسند اور ناپسند کا معیار قرار دینا حرام پایا۔ اسی حقیقت کو اخلاص کہتے ہیں۔ یہی اخلاص عقیدۂ توحید کی جان اور روح ہے۔ اور یہ عقیدہ —— توحید —— تعلق باللہ کا بنیادی پتھر ہے۔

باب ۷

محبّت

ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کرے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عبادت واطاعت اس کی سچّی محبت کے ساتھ ہو۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو یہ عبادت واطاعت نفاق اور ریاکاری بن کے رہ جاتی ہے، جس کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔ وہ ہمارے کسی عمل کا محتاج نہیں ہے کہ جس طرح کبھی کوئی شخص کوئی عمل کر دے اس کو قبول کرے۔ وہ صرف اسی عمل کو قبول فرماتا ہے جو خالص اسی کے لیے کیا جائے اور مارے باندھے نہیں بلکہ اس کی سچی محبت کے ساتھ کیا جائے۔ اس محبت کے لیے معیار یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ یہ دنیا کی تمام چیزوں کی محبت سے بڑھ کر ہو۔

قرآن مجید میں اس کی حد یہ مقرر فرمائی گئی ہے:

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَ	ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے
اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ	بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا
وَ اَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَ	خاندان اور وہ مال جو تم نے کمایا، وہ تجارت
اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ	جس کی کساد بازاری کا تم کو اندیشہ ہے
تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا	اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں اگر

وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ	تمہیں اللہ، اس کے رسول اور اس
اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں
وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا	تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا
حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ	فیصلہ صادر فرما دے اور اللہ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۠	بدعہدوں کو بامراد نہیں کرتا۔

(التوبۃ - ۹ : ۲۴)

یہی بات حدیثوں میں یوں وارد ہوئی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
لایؤمن عبد حتی اکون احبّ	کسی بندے کا ایمان معتبر نہیں ہے جب
الیہ من اھلہ ومالہ	تک کہ میں اس کو اس کے اہل اور اس
والناس اجمعین[1]۔	کے مال اور سارے لوگوں سے زیادہ
	محبوب نہ ہو جاؤں۔

بعض روایات میں 'ومن نفسہ' کے الفاظ بھی آئے ہیں، یعنی 'اس کو اللہ اور رسول اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز و محبوب نہ ہو جائیں:

عن انس عن النبی صلی اللہ	حضرت انسؓ سے روایت ہے: وہ فرماتے
علیہ وسلم قال: ثلاث	ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
من کن فیہ وجد بھن	تین چیزیں جس میں ہوں گی وہ ان سے
حلاوۃ الایمان بمن	ایمان کی حلاوت پائے گا: ایک یہ کہ
کان اللہ ورسولہ احب	اللہ اور اس کا رسول اس کو تمام چیزوں سے
الیہ مما سواھما، وان	زیادہ محبوب ہوں، دوسری یہ کہ وہ کسی

[1] صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب ۱۶

يحب المرء لا يحبه الا لله،	سے صرف اللہ کی خاطر محبت کرے،
وان يكره ان يعود في	تیسری یہ کہ کفر سے نجات پا جانے کے
الكفر بعد ان انقذه الله منه	بعد اس میں لوٹنے کو وہ آگ میں
كما يكره ان يقذف	ڈالے جانے کی طرح مبغوض جانے۔
في النار[1]۔	

ایک سوال اور اس کا جواب :

بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا یہ ممکن بھی ہے کہ جو چیز انسان نے کبھی دیکھی نہ ہو اس سے اس کو محبت ہو اور محبت بھی ایسی کہ دوسری تمام چیزوں کی محبت سے بڑھ جائے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صرف ممکن ہی نہیں، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ انسان خود اپنے وجود کے اندر جو محبت ایک ان دیکھی چیز سے کرتا ہے وہ ان چیزوں سے نہیں کرتا جن کو وہ رات دن دیکھتا ہی نہیں، بلکہ اپنی خدمت میں سرگرم بھی پاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کے کان آنکھ ہر وقت اس کی فرماں برداری میں مستعد ہیں اور وہ ان کی فرماں برداری کا نہایت محتاج ہے، لیکن اس کے سامنے اگر یہ مطالبہ رکھا جائے کہ اسے اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا اور بقیہ سے لازماً دست بردار ہونا ہے تو معقول انسان اپنی ظاہری قوتوں میں سے کسی ایک سے یا تمام سے دست بردار ہونا تو گوارا کرے گا، لیکن وہ کسی قیمت پر بھی اپنی عقل سے دست بردار ہونا گوارا نہیں کرے گا اگرچہ اس نے اسے نہ کبھی دیکھا ہے، نہ چھوا ہے، نہ دیکھ اور چھو سکتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم : کتاب الایمان ، باب ۱۵

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتی ہے کہ اگرچہ اس نے اس کو دیکھا نہیں، لیکن وہ جانتا ہے کہ اس کے اندر وہی جوہرِ لطیف ہے جس پر اس کے تمام شرف اور اس کی ساری عظمت کی بنیاد ہے؛ دوسری تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے اگر وہ محروم ہو جائے تو اس سے اس کی اس حیثیت عُرفی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا جو بحیثیت انسان اس کو حاصل ہے، لیکن عقل سے اگر وہ محروم ہو جائے تو دفعتہً وہ اشرف المخلوقات کے مرتبۂ بلند سے گر کر ارذل حیوانات کے درجہ میں آجائے گا۔

یہی حال اس کائنات کی دوسری چیزوں کا بھی ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک لاکھوں، کروڑوں چیزیں ہیں جن سے انسان شب و روز نفع اٹھا رہا ہے، لیکن وہ یہ جانتا ہے کہ یہ چیزیں اس کی نفع رسانی میں از خود نہیں لگی ہوئی ہیں، بلکہ ایک مخفی ذات نے، محض اپنے فضل و کرم سے ان کو اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ان میں سے نہ کسی چیز کو اس نے پیدا کیا ہے، نہ پیدا کر سکتا ہے اور نہ ان کے پیدا کرنے والے پر اس کا کوئی حق ہی قائم ہے جس کی بنا پر وہ ان کی خدمت کا حق دار بن سکے۔ خاص طور پر جب یہ حقیقت اس پر واضح ہوتی ہے کہ دنیا میں جو محبوب سے محبوب چیز بھی اس کو حاصل ہے وہ اسی مخفی ذات کی بخشش سے حاصل ہے، وہ جب چاہے اس کو واپس لے سکتی ہے، کوئی دوسرا اس کو واپس نہیں دلا سکتا تو اس کا دل اس کی محبت سے اس طرح سرشار ہو جاتا ہے کہ ہر چیز اس کی محبت کے آگے ہیچ ہو جاتی ہے۔

پس یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ انسان خدا سے محبت نہیں کر سکتا۔ خدا مخفی ضرور ہے، لیکن اس کے مخفی ہونے کی مثال یوں ہے کہ گویا تل کے اوٹ میں پہاڑ ہو۔ آسمان اور زمین کے ہر گوشے سے اس کی منادی ہو رہی ہے؛ ابر اور ہوا سب اس کی شہادت دے رہے ہیں؛ دریا اور پہاڑ، سب اس کے گواہ ہیں؛ پرندے اس کی حمد کے گیت گاتے اور درخت ان کے نغموں سے سرشار ہو کر جھوم رہے ہیں؛ اس دنیا کے ذرہ ذرہ پر اس کا

نقش کندہ اور ایک ایک پتہ پر اس کی گواہی ثبت ہے۔ ایک ایسی ذات کو مخفی سمجھنا انسان کی اپنی عقل کا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ مخفی نہیں، بلکہ بدیہی ہے، بلکہ صحیح تر لفظوں میں یوں کہیے کہ ابدہ البدیہیات ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انسان کو ایسے مغالطے پیش آجاتے ہیں، جن کے سبب سے وہ اس کی صحیح معرفت سے محروم رہ جاتا ہے اور جب تک ایک چیز کی معرفت حاصل نہ ہو اس سے معمولی محبت بھی کرنا ممکن نہیں چہ جائیکہ تمام چیزوں سے بڑھ کر۔ بس یہی محرومی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم رکھتی ہے۔

خدا سے محبت کے لیے اس کی معرفت ضروری ہے:

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی راہ میں اصلی حجاب اس کا مخفی ہونا نہیں، بلکہ اس کی صحیح معرفت سے محروم ہونا ہے۔ اس محرومی کے باعث آدمی خدا کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جو محبت تو درکنار سرے سے اس کا تعلق ہی خدا سے کاٹ دیتی ہیں۔

مثلاً بسا اوقات اس کو خدا کی قدرت اور اس کے علم کے باب میں غلط فہمی پیش آجاتی ہے، جس کے سبب سے وہ یہ گمان کر بیٹھتا ہے کہ اس عالم کا انتظام اس نے اپنے بہت سے مددگاروں میں تقسیم کر رکھا ہے اس وجہ سے صرف اسی کی عبادت کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ان شریکوں کی عبادت بھی ضروری ہے۔ پھر خاص طور پر ان شریکوں سے محبت وہ خدا سے بھی زیادہ کرتا ہے جن سے اس کے خیال میں خود اس کی اپنی ضرورتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ کبھی خدا کے عدل کے صحیح تصور سے محروم ہونے کے باعث یا تو اس بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ خدا کے ہاں خیر و شر میں سرے سے کوئی امتیاز ہے ہی نہیں یا بعض ظاہری یا مخفی ہستیوں سے متعلق اس گمان میں پھنس جاتا ہے کہ وہ خدا کے ایسے مقرب اور چہیتے ہیں کہ وہ جس کے لیے چاہیں دنیا میں بھی اس کو خدا اپنے انعامات سے نوازے

گا اور آخرت ہوئی تو اس میں بھی اس کو بخش دے گا، خواہ اس کے اعمال کچھ ہوں۔ چنانچہ وہ خدا کو چھوڑ کر اس کے ان مفروضہ مقربین ہی کی عبادت اور محبت کو اپنا دین بنا بیٹھتا ہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ اس سنتِ الٰہی سے بے خبر رہتے ہیں جس کے تحت اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو دکھ یا سکھ دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو خدا سے ڈھیٹ اور بے پروا ہو جاتے ہیں یا مایوس اور دل شکستہ۔ مثلاً اللہ تعالیٰ بعض لوگوں پر اپنا فضل فرماتا ہے کہ دیکھے وہ اس فضل کو پاکر اس کے شکر گزار رہتے ہیں یا مغرور و متکبّر بن کر اکڑنے اور اترانے لگتے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اس رمز سے واقف نہیں ہوتے وہ اس نوازش کو خدا کی طرف سے اپنی عزت افزائی سمجھ کر اکڑنے اور اترانے لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے صبر کے امتحان کے لیے ان کو کسی آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اگر وہ اس رمز سے واقف نہیں ہوتے تو وہ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ خدا نے ان کو ذلیل کر دیا ہے۔ جس کا اثر ان پر یہ پڑتا ہے کہ وہ خدا سے مایوس اور بدگمان ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کی غلط فہمیاں ہیں جو بالآخر شرک کے دروازے کھولتی اور انسان کو شیطان کے جال میں پھنساتی ہیں۔ ان سے محفوظ رہنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انسان کو خدا کی صحیح معرفت حاصل ہو۔ ایسی معرفت کہ شیطان کو اس کے اندر گھسنے کی کوئی راہ نہ ملے۔ اگرچہ ایسی مکمل رخنہ بندی آسان نہیں ہے، لیکن خدا کی صحیح معرفت سے وہ لوگ اپنے آپ کو شیطان کے حملوں سے بچا سکتے ہیں جو بچنا چاہیں۔ رہے وہ لوگ جو خود شیطان کے فتنوں میں پڑنا چاہتے ہیں تو ان کو اس کے جال سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔

خدا کی معرفت سے ہماری مراد صوفیانہ معرفت نہیں ہے۔ صوفیانہ معرفت کی بے حقیقتی اس کتاب کے پہلے حصہ میں ہم واضح کر چکے ہیں۔ بلکہ اس سے ہماری مراد وہ معرفت ہے جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔

یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ محض ایک اجمالی تصور دینے کے لیے ہم بعض اصولی باتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

خدا کی معرفت کا سب سے زیادہ قطعی اور قابلِ اعتماد ذریعہ خدا کے وہ اسماء اور صفات ہیں جو اس نے خود اپنی کتاب میں بیان فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کو خود ہی سب سے بہتر جانتا ہے اس وجہ سے اس نے بندوں کو اپنی صفات کے معاملے میں دخل اندازی سے منع فرمادیا ہے:

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ (النحل - ۱۶ : ۷۴)	تو تم اللہ کے لیے اپنے جی سے مثالیں نہ بیان کرو۔

ایک ماثور دعا میں بندے کی زبان سے خدا کی صفات کے باب میں یہ اعترافِ عجز نقل ہوا ہے:

لا احصی ثناء علیک۔ انت کما اثنیت علی نفسک[1]	میں تیری ثنا کا حق ادا نہیں کرسکتا تو ویسا ہی ہے جتنی تو نے اپنی ثنا بیان فرمائی ہے۔

انسان اگر اپنے جی سے اللہ تعالیٰ کی صفتیں بیان کرے گا تو وہ اس کو اپنی خواہشوں کے مطابق ایک مہادیو بنا کے رکھ دے گا اور پھر اپنے سارے دین کو اپنے اسی غلط تصور کے تحت اپنی خواہشوں کے سانچے میں ڈھال لے گا۔ مذاہب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے بارے میں تصور کی غلطی تمام بنیادی غلطیوں کا سبب ہوتی ہے، اس وجہ سے سب سے زیادہ ضروری خدا کی صفات کی سچی معرفت ہی ہے۔ اسی سے بندے کو خدا کی پسند اور ناپسند کا بنیادی علم ہوتا ہے۔ اسی سے وہ خدا کی قدرت، ربوبیت، رحمت اور حکمت کا تصور حاصل کرتا ہے جو اس کے ایمان

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب ۴۲

توکل، صبر اور رضا کی بنا دیں استوار کرتا اور جہادِ زندگانی میں اس کے لیے عزم اور قوت فراہم کرتا ہے۔ اسی سے اس کے اندر خدا کی وہ خشیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ تنہائی کے گوشوں میں بیٹھا ہوا بھی یقین رکھتا ہے کہ اگرچہ وہ خدا کو نہیں دیکھ رہا ہے، لیکن خدا اس کو ضرور دیکھ رہا ہے۔ یہی چیز اس کو توحیدِ حقیقی کا یہ شعور دیتی ہے کہ جو چیز اس کو خدا دینے والا نہیں ہے اس کو کوئی دوسرا دینے والا نہیں بن سکتا اور جو چیز اس کے رب نے اس کے لیے مقدر کر رکھی ہے آسمانوں اور زمین میں کسی کی قدرت نہیں کہ اس سے اسے محروم کر سکے۔ اسی سے اس کو یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے بندوں کے ساتھ تمام تر اس کے عدل، علم اور رحم پر مبنی ہے، کوئی دوسرا اس میں اس کے اذن کے بدون زبان نہیں کھول سکتا۔ پھر سب سے زیادہ اہم بات تزکیہ کے پہلو سے یہ ہے کہ خدا کی صفات ہی کے آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر وہ صحیح صحیح اندازہ کرتا ہے کہ کیا چیزیں اس کے اندر موجود نہیں ہیں جن کا ہونا ضروری ہے اور کیا چیزیں اس کے اندر ایسی ابھر آئی ہیں جو اس کے خالق کی پسند کے خلاف ہیں۔

یہ حقیقت یہاں یاد رکھیے کہ تمام علم اور تمام شریعت کی بنیاد درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کے مقتضیات ہی پر ہے۔ انہی کی معرفت سے صحیح علم و معرفت کی راہیں کھلتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کا راستہ:

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ خدا کی معرفت حاصل کرنے کا صحیح راستہ کیا ہے؟ اس سوال پر ہمارے علماء نے بہت کچھ لکھا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں اس پر بڑی جامع اور مطالعہ کے قابل بحث لکھی ہے۔ حضرات صوفیاء سے بھی اس باب میں بے شمار اقوال منقول ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس پر سب سے دل نشین

بحث امام ابن قیمؒ علیہ الرحمۃ نے اپنی بے مثال تصنیف، مدارج السالکین میں کی ہے۔ انہوں نے اس کے لیے جو طریقہ بتایا ہے ہمارے نزدیک اس کی بنیاد کتاب وسنّت اور عقل و فطرت پر ہے، اس وجہ سے ان کی بحث کا خلاصہ یہاں ہم اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے محبتِ الٰہی کے حصول کے لیے مندرجہ ذیل دس باتیں اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

(۱) قرآن مجید کا مطالعہ پورے غور و تدبّر کے ساتھ اس طرح کہ اس کے معانی و حقائق تک رسائی حاصل ہو۔

(۲) فرائض کے ساتھ ساتھ نوافل کا اہتمام تاکہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہو۔ یہ چیز آدمی کو درجہ بدرجہ خدا کی محبت سے اس کی محبوبیّت کے درجہ تک پہنچاتی ہے۔

(۳) ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام۔ یہ ذکر زبان، دل، عمل اور حال ہر چیز سے ہو۔ اس میں جتنی ہی سرگرمی ہوگی اسی کے بقدر محبتِ الٰہی میں آدمی کا حصّہ ہوگا۔

(۴) اس امر کی کوشش کہ جب نفس کی خواہشیں زور لگائیں تو آدمی اپنی پسند کو چھوڑ کر خدا کی پسند کو اختیار کرے۔ یہ چڑھائی اس کو کتنی ہی ہمت آزما نظر آئے، لیکن وہ ہمت نہ ہارے۔

(۵) دل اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے مطالعہ، ان کے اسرار و حقائق کے مشاہدہ اور ان کی معرفت کے چمنستانوں کی سیر میں برابر لگا رہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو اس کے اسماء وصفات اور اس کے افعال کی راہ سے پہچانے گا وہ لازماً اس سے محبت بھی کرے گا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی صفات کے منکر ہیں ان کے لیے اس کی محبت میں کوئی حصّہ نہیں۔

(۶) برابر اللہ تعالیٰ کے افضال و احسانات، اس کی شانوں اور کرشموں اور اس کی ظاہری و باطنی نعمتوں پر نگاہ رکھے۔ یہ چیز خاص طور پر اس کی محبت

پیدا کرنے والی ہے۔

(۷) اور ان سب سے بالاتر شان رکھنے والی چیز رب کے سامنے بندے کے دل کا کامل انکسار ہے، جس کی حقیقت کی تعبیر الفاظ کی گرفت سے باہر ہے۔

(۸) جو اوقات اللہ تعالیٰ کے سمائے دنیا پر نزول کے ہیں ان میں اس سے مناجات، اس کے کلام کی تلاوت، آدابِ عبودیت کے ساتھ اس کے حضور میں حاضری کا اہتمام اور آخر میں استغفار اور توبہ پر اس کا اختتام۔

(۹) اللہ تعالیٰ کے صادق محبوں کی ہم نشینی، ان کے پاکیزہ ارشادات کی خوشہ چینی اور اس امر کا اہتمام کہ اس وقت تک زبان سے کوئی کلمہ نہ نکالے جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ اب بات کہنے میں ہی اپنے حال کی اصلاح اور دوسروں کی مصلحت ہے۔

(۱۰) ان تمام چیزوں سے کلی احتراز جو آدمی کے دل اور اس کے رب کے درمیان حائل ہونے والی ہیں۔

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ یہ راستہ ہے جس کو اختیار کر کے طالبینِ حق نے اللہ تعالیٰ کی محبت اور محبوبیت کا مقام پایا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ ارشاد صدق صدحق ہے۔ یہی راستہ کتاب وسنت کا بتایا ہوا راستہ ہے۔

محبتِ الٰہی کے حصول کا عملی راستہ:

یہ راستہ جو بیان ہوا یہ علمی راستہ ہے۔ قرآن مجید نے اس کا ایک عملی طریقہ بھی بتایا ہے، جو ایک معین اور محسوس شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے اور جس کو وہ لوگ بھی اختیار کر سکتے ہیں جو زیادہ علمی کاوشوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہ راستہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے وجودِ گرامی کو دنیا میں اپنے کامل محب اور اپنے کامل محبوب کے ایک پیکرِ قدسی کی شکل میں مبعوث فرمایا تاکہ لوگ ایک چلتی پھرتی

اور تمام نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی زندگی میں دیکھ لیں کہ اللہ کے محب اور اس کے محبوب کی زندگی کیا ہوتی ہے اور وہ اپنے گھر میں اور گھر سے باہر لوگوں کے اندر اپنے شب و روز کس طرح گزارتا ہے۔ ظاہر ہے کہ محبت اور محبوبیت جیسے نازک مسئلہ کو سمجھانے کے لیے سب سے زیادہ سہل راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک چلتی پھرتی زندگی میں اس کو لوگوں کے سامنے ممثل کر دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی کیا جس کا ذکر سورۂ آلِ عمران میں یوں ہوا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔	کہہ دو، اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا۔

(آل عمران - ۳ : ۳۱)

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم محبت اور محبوبیت، دونوں کے کامل نمونہ ہیں۔ یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی محبت یا محبوبیت کا کوئی ایسا نمونہ بھی ہو سکتا ہے جو حضورؐ کے نمونہ سے اعلیٰ ہو۔ چنانچہ حضورؐ کے ارشادات پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جب کبھی کسی نے زندگی کے کسی معاملہ میں اس حد سے آگے قدم بڑھانے کی کوشش کی جو حضورؐ کی مقرر کردہ حد سے ذرا بھی متجاوز تھی تو آپ نے یہ کہہ کر اس کو روک دیا کہ میں اللہ سے تمہاری نسبت زیادہ محبت کرنے والا اور زیادہ ڈرنے والا ہوں، تو جب میں ایک کام کرتا ہوں تو تم اس کو تقویٰ کے خلاف کیوں سمجھو!

ایک تنبیہ:

یہ امر نگاہ میں رہے کہ ہم نے لفظ 'محبت' استعمال کیا ہے، 'عشق' یا اس قسم کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے لیے قرآن اور حدیث، دونوں میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے، کہیں عشق کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ یہ کہ لفظ 'عشق' ایک غیر متوازن کیفیت پر دلیل ہوتا ہے اس وجہ سے اللہ اور رسول کے لیے اس کا استعمال نہ صرف ناموزوں ہے، بلکہ اس میں احتمال سوءِ ادب کا بھی ہے۔ اللہ و رسول کے ساتھ بندوں کے سارے معاملات حدودِ شریعت کے پابند ہیں۔ اگر بال برابر بھی ان سے تجاوز ہو جائے تو گویہ تجاوز جذبۂ عشق کی تحریک ہی سے ہو، لیکن اس سے بدعت اور ضلالت میں پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لفظ عشق کا استعمال زیادہ تر شاعروں نے کیا ہے یا صوفیوں نے۔ شاعروں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ جب تک ہر چیز کو لیلیٰ اور مجنوں کی حکایت نہ بنالیں ان کی شاعری بے مزا رہتی ہے اس وجہ سے وہ چاہے روزہ اور نماز سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں، لیکن وہ اللہ سے بھی عشق رکھتے ہیں اور اس کے رسول سے بھی۔ ان کے ہاں ہر نعت گو اور ہر قوال عاشقِ رسول ہوتا ہے صوفیوں کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر میدان میں، جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے پہلے حصّہ میں واضح کیا ہے، اپنا گول اصحابِ شریعت سے آگے باندھنے کی کوشش کی ہے اس وجہ سے انہوں نے محبت کے عام اور معروف لفظ کو اپنے جذبۂ محبت کی تعبیر سے قاصر پایا اور اس کی جگہ لفظ عشق کو اختیار کیا جو ان کے ہاں اصل محبوب لفظ ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک نزاعِ لفظی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس عشق نے تصوف میں جو بدعتیں داخل کی ہیں ان کا شمار ممکن نہیں ہے۔

محبت، عشق کی طرح، کوئی مبہم، مجہول اور بے قید چیز نہیں ہے، بلکہ ایک معروف، معین اور پابندِ آئین چیز ہے۔ یہ ایک جانی پہچانی کسوٹی ہے جس پر آدمی اپنے کو بھی اور دوسروں کو بھی پرکھ کر دیکھ سکتا ہے کہ کس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کے سامنے جب کوئی ایسا موڑ

آئے جب اسے یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ دو راستوں میں سے وہ کون سا راستہ اختیار کرے: وہ راستہ جو اس کی خواہشوں، اس کی حاضر مصلحتوں، اس کے عزیزوں اور دوستوں کی رائے اور پسند کے موافق ہے، لیکن اس کے اپنے علم کے حد تک وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے؛ یا وہ راستہ جو اگرچہ ان سب کی رائے کے خلاف ہے جن کی دلداری اس کو عزیز ہے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے موافق ہے۔ اس صورت میں اگر وہ اپنی خواہشوں اور اپنے ہوا خواہوں کی پاسداری کو ترجیح دے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خدا سے زیادہ دوسروں سے محبت کرتا ہے اور اللہ پر ایمان کا دعویٰ محض ادّعاء ہے اور اگر وہ دوسری راہ پسند کرتا ہے، یعنی سب کو نظرانداز کر کے بے دھڑک اللہ کے حکم کو اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا سچا محب بھی ہے اور سچا محبوب بھی اگرچہ اس نے عشقِ الٰہی کا کبھی دعویٰ نہ کیا ہو۔

یہ محبت ہے جس کا دین میں اعتبار اور جس پر آدمی کے اُخروی مراتب کا انحصار ہے۔ اس کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے خود قرآن نے ایک واضح کسوٹی بھی مقرر کر دی ہے جس پر ہر مدعی کو آپ جب چاہیں جانچ سکتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنے زعم میں، محبت کے زیر اثر، گریبان اور دامن چاک کر کے برہنہ سر اور برہنہ پا گھروں سے نکل کھڑے ہوتے اور صحراؤں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں تو ان کی محبت کو پرکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی کسوٹی نہیں ہے اور یہ کہنا بھی ہمارے لیے مشکل ہے کہ فی الواقع یہ عشقِ الٰہی ہے یا عشقِ لیلیٰ ہے یا محض خللِ دماغ ہے۔

خوف

جس طرح اللہ تعالیٰ کی محبت ایمان کے لازمی مقتضیات و مطالبات میں سے ہے اسی طرح خوف بھی اس کے بدیہی مطالبات میں سے ہے اور جس طرح ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دوسری تمام محبتوں پر غالب و حاکم ہو۔ اسی طرح یہ بھی واجب ہے کہ خدا کا خوف دوسرے تمام خوفوں پر غالب و حاکم ہو۔ چنانچہ قرآن نے جس طرح فرمایا ہے کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی محبت میں سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط (البقرۃ ۲ : ۱۶۵) (جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہوتے ہیں) اسی طرح ان لوگوں کو جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے ڈر سمائے ہوئے تھے تنبیہ فرمائی کہ:

اَتَخْشَوْنَھُمْ ج فَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْہُ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ o (التوبۃ ۔ ۹ : ۱۳)	کیا تم ان سے ڈرو گے؟ اصل حقدار تو اللہ ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم واقعی مومن ہو۔
اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ ق فَلَا تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِیْ ق (البقرۃ ۔ ۲ : ۱۵۰)	مگر جو ان میں سے ظالم ہیں تو ان سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وجہ:

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ العیاذ باللہ وہ مشرکین کے خیالی بھوتوں کی طرح کوئی ہولناک اور ڈراؤنی چیز ہے کہ ذرا ناخوش ہو جائے تو سب کو تباہ و پامال کر کے رکھ دے۔ اس نے اپنی جو صفتیں قرآن میں بتائی ہیں وہ سب اچھی، جمیل اور دل کو طمانیت بخشنے والی ہیں۔ بعض صفتیں اس کے جلال و جبروت کو ظاہر کرنے والی ضرور ہیں لیکن ان کی صحیح نوعیت ہم نے اپنی تفسیر —— تدبرِ قرآن —— میں واضح کر دی ہے کہ یہ اس کی عظمت و قدرت کی بے پناہی اور اس کے حیطۂ قدرت کی ہمہ گیری کے اظہار کے لیے ہے تاکہ اہلِ ایمان کو ان سے پورا اعتماد حاصل ہو۔ اہلِ کفران سے عبرت و تنبیہ حاصل کریں۔ ان سے یہ تاثر لینا کہ اللہ تعالیٰ کوئی خوفناک چیز ہے ان کی روح کے بالکل منافی بات ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جمیلہ کے جو تقاضے ہیں اور ان سے جو سنن و قوانین ظہور میں آئے ہیں وہ بجائے خود ایسے اہم، اٹل اور بے پناہ ہیں کہ جو شخص بھی ان کا علم رکھتا ہے وہ لازماً اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔

یہ صفات اور ان کے تقاضے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نہایت تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔ جو لوگ قرآن سے نابلد ہیں وہ تو بے شک بے خوفی کی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن جو اس سے آشنا ہیں ان کا حال خود اس کتاب ہی میں بیان ہوا ہے کہ "تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا" (السجدۃ - ۳۲ : ۱۶) (ان کے پہلو بستروں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں خوف اور طمع سے)۔ جو قدم وہ اٹھاتے ہیں یہ اچھی طرح سوچ کر اٹھاتے ہیں کہ ایک دن ان کو اپنے مالک کے آگے ہر قول و فعل کا حساب دینا ہے۔ چنانچہ یہ بات قرآن میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حقیقی ڈرنے والے اس کے بندوں میں سے وہی ہوتے ہیں

جو اس کتاب کا علم رکھنے والے ہیں۔ فرمایا:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ	اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی
الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ	ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں بے شک
(فاطر - ۳۵ : ۲۸)	اللہ غالب اور بخشنے والا ہے۔

اس آیت میں عُلَمَاء سے مراد، ظاہر ہے کہ اصطلاحی علماء نہیں ہیں، بلکہ وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے عطا کیے ہوئے حقیقی علم کے وارث ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی صحیح صفات اور اس کے سنن اور قوانین سے اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اس سے اس طرح ڈرتے ہیں جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ رہے وہ لوگ جو نہ اس کی صفات ہی سے واقف ہیں اور نہ اس کے سنن و قوانین ہی سے، ان لوگوں کے لیے نہ اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ ہے نہ وہ ڈرتے ہی ہیں اور اگر ڈرتے بھی ہیں تو اس طرح نہیں ڈرتے جس طرح اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے، بلکہ اس طرح ڈرتے ہیں جس طرح ایک بت پرست اپنے خیالی بھوت سے ڈرتا ہے۔ درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے لیے قرآن نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے: 'یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ' (آل عمران - ۳ : ۱۰۲) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے)۔ مسئلہ کا یہ پہلو تقاضا کرتا ہے کہ قرآن کی روشنی میں ہم خوفِ الٰہی کے چند پہلو واضح کریں تاکہ ان لوگوں کو ان سے رہنمائی حاصل ہو جو صحیح علم کے طالب ہیں۔

خوفِ الٰہی کے اصلی محرکات:

قرآن نے اللہ تعالیٰ سے برابر ڈرتے رہنے کے جو وجوہ تفصیل سے بیان کیے

ہیں ان میں سے سب سے پہلی وجہ، جس کی بار بار وضاحت فرمائی ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور اس نے یہ دنیا ایک عظیم حکمت و غایت کے ساتھ پیدا کی ہے۔ اس کی اس حکمت کا بدیہی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں کو ان کی نیکیوں کا صلہ دے جو اس دنیا میں نیکی اور پرہیزگاری کی زندگی گزاریں اور ان لوگوں کو قرار واقعی سزا دے جو دھاندلی اور فساد مچائیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے نزدیک نیکی اور بدی میں سرے سے کوئی فرق نہیں ہے اور وہ اس امر سے بالکل بے تعلق ہے کہ کون اس کی دنیا میں تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی گزارتا ہے اور کون نافرمانی اور بغاوت کی۔ یہ فرض کرنا اللہ تعالیٰ کی صفاتِ رحمت، ربوبیت، عدل اور قدرت و حکمت کی کلی نفی ہے۔ چنانچہ قرآن نے قیامت کے منکروں کو خطاب کر کے جگہ جگہ یہ فرمایا ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟ یا یہ سوال کیا ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ جو علم والے ہیں وہ اور جو علم سے محروم ہیں وہ، دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر قیامت نہیں ہے، جیسا کہ تم گمان کرتے ہو، تو اس کا نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ نیک اور بد اور عالم و جاہل، دونوں یکساں ہو جائیں اور یہ دنیا ایک کھلنڈرے کا کھیل اور ایک بازیچۂ اطفال بن کے رہ جائے۔ اگر یہ فرض کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو ہر عاقل پر یہ واجب ہے کہ وہ خدا کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچنا چاہتا ہے تو اس کے حضور پیشی سے برابر ڈرتا رہے اور اپنی خواہشوں کو لگام دے۔ اس گروہ کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ	یہ لوگ آسمانوں اور زمین کی خلقت
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ	پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی دعا یہ
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ	ہوتی ہے کہ اے پروردگار، تو نے یہ

هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝
(آل عمران - ۳ : ۱۹۱)

کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے۔ سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

رہے وہ لوگ جو اس دنیا کو ایک بازیچۂ اطفال اور اس کے خالق کو العیاذ باللہ ایک کھلنڈرا گمان کر کے اپنی زندگی بے خوفی میں گزار رہے ہیں لازم ہے کہ ایک دن وہ اپنی اس حماقت کا انجام دیکھیں۔

دوسری وجہ خدا سے ڈرنے کی یہ ہے کہ جو پکڑ وہ پکڑ سکتا اور جو سزا وہ دے سکتا ہے کوئی دوسرا، خواہ کتنا ہی بڑا بادشاہ اور کتنا ہی بڑا جبّار ہو، نہ وہ اس طرح پکڑ سکتا اور نہ اس کی طرح کسی کو سزا دے سکتا۔ چنانچہ اس نے خود اپنی تعریف یہ فرمائی ہے کہ "لَا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗ اَحَدٌ ۙ وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗ اَحَدٌ ؕ"
(الفجر - ۹۸ : ۲۵-۲۶) (نہ اس کا سا کوئی عذاب دے سکتا اور نہ اس کا سا باندھنا کوئی باندھ سکتا) اس کی وجہ ظاہر ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا جبّار بھی کسی کو بڑی سے بڑی سزا جو دے سکتا ہے وہ بہرحال اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہو گی۔ اگر کوئی دوسرا نہیں تو موت آ کر اس کو اس زندگی اور اس کے عذاب دونوں سے نجات دے سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ جو عذاب دے گا وہ ایک ابدی زندگی میں ہو گا جس کو نہ کوئی ختم کر سکتا اور نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس کی کلفتوں سے نجات دلا سکتا یا اس میں کوئی تخفیف ہی کر سکتا۔

دوسروں کی گرفت یا ان کے دائرۂ اقتدار سے بچ نکلنا بھی ناممکن نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ کی خدائی آسمانوں اور زمین کے ایک ایک گوشہ پر محیط ہے۔ ان کی حدود سے باہر نکل بھاگنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے، نہ کسی جن کے لیے

نہ کسی انسان کے لیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں دونوں کو مخاطب کرکے آگاہ فرمایا ہے کہ:

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ (الرحمٰن - ۵۵: ۳۳)	اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! اگر تم یہ کر سکو کہ نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کے اطراف سے تو نکل بھاگو۔ تم میرے پروانۂ راہداری کے بدون نہیں نکل سکو گے۔

دنیا کے قہاروں اور جباروں کے سراغ رسانوں اور ان کی پولیس سے بچ نکلنے کی سو تدبیریں ہو سکتی ہیں۔ سائنس کی اس ترقی کے زمانے میں بھی آئے دن ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ مضبوط سے مضبوط جیلوں کے اندر اور ہوشیار سے ہوشیار پہرہ داروں کی نگرانی سے بھی بھاگنے والے بھاگ ہی جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا فرشتۂ اجل ایسا بے پناہ ہے کہ کوئی اس کے پنجے سے کسی طور بھی چھوٹ نہیں سکتا اور اس کی رسائی مضبوط سے مضبوط قلعوں کے اندر بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے مجرموں کے لیے جو جیل بنائی ہے اس پر اس نے ایسے سخت گیر ملائکہ مامور کیے ہیں جو کسی کی آہ و فریاد سے متاثر ہو کر نہ ذرا اس پر ترس کھائیں گے، نہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں ذرا چشم پوشی برتیں گے: 'عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ' (التحریم - ۶۶ - ۶) (اس پر درشت مزاج اور سخت گیر ملائکہ مامور ہوں گے۔ اللہ ان کو جو حکم دے گا اس کی تعمیل میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کریں گے)۔

اس معاملہ کا تیسرا پہلو جو مذکورہ دونوں باتوں سے بھی اہم ہے یہ ہے کہ اس دنیا میں فدیہ، رشوت اور سفارش سے بھی بہت سے کام نکل آتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ

کی گرفت سے بچنے کے لیے یہ حربے بے سود ہیں۔

جہاں تک فدیہ اور رشوت کا تعلق ہے، اوّل تو کسی کے پاس وہاں کوئی چیز ہوگی ہی نہیں اور ہو بھی تو وہ کس کو فدیہ یا رشوت دے گا؟ کیا العیاذ باللہ اللہ تعالیٰ کو؟ اس دن کے ہولناک عذاب سے چھوٹنے کے لیے مجرمین چاہیں گے تو ضرور کہ اپنی عزیز سے عزیز چیز بھی فدیہ میں دے کر عذاب سے چھوٹ سکیں تو اپنے کو چھڑا لیں، لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہیں ہوگی۔ وہ دن جزائے اعمال سے دوچار ہونے کا ہوگا۔ عمل ہی چھڑائے گا اور عمل ہی سزا دلوائے گا: "كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ" (الطور - ۵۲: ۲۱) (ہر ایک اس کمائی کے بدلے میں گرد ہوگا جو اس نے کی ہوگی) اس دن مجرمین کی بے بسی اور بے کسی کا حال قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۝ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۝ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۝ كَلَّا ط (المعارج ۷۰: ۱۱-۱۵)	مجرم تمنا کرے گا کہ کاش! اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنے بیٹوں اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے اس کنبہ کو جو اس کو پناہ دیتا رہا ہے اور تمام اہل زمین کو فدیہ میں دے کر اپنے کو بچالے، لیکن ان کی یہ تمنا ہرگز بر نہیں آئے گی۔

ناوالوں نے اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے سب سے زیادہ اعتماد اپنے فرضی معبودوں، اپنے پیروں، اپنے مشائخ اور ولیوں اور نبیوں کی سفارش پر کیا ہے۔ جس طرح مشرکین عرب اس وہم میں مبتلا تھے کہ اپنے جن دیویوں، دیوتاؤں کی وہ پرستش کرتے ہیں ان کو خدا کے ہاں وہ مقام حاصل ہے کہ وہ اپنے پجاریوں

کو اپنے زور و اثر سے، خدا کی پکڑ سے بچالیں گے اسی طرح اس دور کے کتنے مسلمان اپنے پیروں اور مشائخ کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ ان کو ساتھ لیے بغیر تنہا جنت میں نہیں جائیں گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان کی دل داری میں ان کے تمام متوسلین کو جنت میں ضرور بھیجے گا، قطع نظر اس سے کہ ان کے عقائد و اعمال کیا ہیں۔ گویا اصل چیز ان کے نزدیک، نجات کے لیے اللہ اور رسول سے تعلق نہیں، بلکہ کسی مزار اور صاحبِ مزار سے توسّل ہے۔ ان کی سفارش کی امید نے ان کو دین کی تمام ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے اس طرح کے لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ شفاعت کے باب میں اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کیا ہیں، ورنہ وہ اپنی عاقبت اس طرح خطرہ میں نہ ڈالتے۔ ہم قرآن کی روشنی میں چند اہم باتیں یہاں بیان کرتے ہیں تاکہ اس طرح کے بے خبر دل کو آگاہی حاصل ہو۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ خدا کے حضور میں ناز اور تدلّل سے بات کرنا تو درکنار کوئی شخص اس کے اذن کے بغیر زبان کھولنے کی جرأت ہی نہیں کرسکے گا۔ صرف وہی زبان کھولے گا جس کو اجازت مرحمت ہوگی۔ اس پابندی سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ مقرب ترین فرشتوں کے متعلق بھی قرآن میں بیان ہوا ہے کہ 'لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ' (الانبیاء — ۲۱ : ۲۷) (وہ اس کے آگے بات میں پہل نہیں کرتے)۔ یعنی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن نہ ہو جبریل امین بھی زبان نہیں کھولتے تو تا بہ دیگراں چہ رسد! یہی بات جگہ جگہ نبیوں اور رسولوں کے متعلق ارشاد ہوئی ہے تو کسی پیر یا شیخ سے متعلق یہ بات کیسے باور کی جاسکتی ہے کہ وہ پہل کر کے اللہ تعالیٰ سے کوئی بات ناز و تدلّل سے کہنے کی جرأت کرسکے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس کو بات کرنے کی اجازت ملے گی وہ صرف اس

شخص کے بارے میں بات کرے گا جس کے لیے اس کو اجازت ملے گی۔ مجال نہیں ہے کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کے باب میں لب کشائی کر سکے۔ اس کی وضاحت بھی قرآن نے ان الفاظ میں کر دی ہے:

وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ○ (الانبیاء - ۲۱ : ۲۸)	اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کے لیے جس کے لیے اللہ پسند فرمائے اور وہ اس کی خشیت سے لرزاں رہتے ہیں۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف وہی بات کہے گا جو حق ہو گی، کوئی خلافِ حقیقت بات زبان سے نکالنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے بارے میں سب سے زیادہ خود جانتا ہے۔ کوئی شخص اس پوزیشن میں نہیں ہو سکتا کہ کسی کے متعلق وہ یہ کہہ سکے کہ وہ اس کے بارے میں خدا سے زیادہ جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم سب کو محیط ہے۔ دوسروں کو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا اس نے بخشا ہے اس وجہ سے کسی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ خدا کے سامنے دروغ بافی کر سکے۔

چوتھی حقیقت یہ ہے کہ کوئی سفارش نہ حق کو باطل بنا سکتی اور نہ باطل کو حق۔ اگر ایسا ہو تو اس سے وہی بات لازم آتی ہے کہ جو قیامت کے نہ ہونے سے آتی ہے۔ یعنی یہ دنیا ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے جو ایک حکیم خدا کی صفات اور شان کے منافی ہے۔

پانچویں یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نجات کو کلیتہً آدمی کے اعمال اور اپنی رحمت سے وابستہ کیا ہے نہ کہ کسی کی سفارش سے:

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا	پس جس نے ذرّہ برابر بھی نیکی کی

يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال - ۹۹: ۷-۸)

ہوگی وہ بھی اس کو دیکھے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھے گا۔

ان کلیات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شفاعت کا دائرہ اتنا کشادہ نہیں ہے جتنا اپنی خواہشوں کو الاؤنس دینے والوں نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ یہ بہت محدود ہے۔ اس سے فائدہ انہیں لوگوں کو پہنچے گا جو اللہ تعالیٰ کے قانونِ عدل کے تحت اس سے فائدہ اٹھانے کے حق دار ہوں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ یہ اس عدل و قسط کو باطل کر دے جس پر تمام شریعت، بلکہ تمام نظامِ عالم کی بنیاد ہے۔

زندگی پر خوفِ الٰہی کے اثرات:

جو شخص قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال و جبروت پر، کائنات میں خالق کی بے پناہ قدرت و عظمت پر اور قوموں کی تاریخ میں اس کے عدل و قسط کے ظہور کی نشانیوں پر غور کرتا ہے تو بعض اوقات اس پر ایسی ہیبت و دہشت طاری ہو جاتی ہے کہ زندگی کی ہر لذت تلخ معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن یہ ہیبت و دہشت عقل و فکر کی راہ سے آتی ہے اس وجہ سے نہ تو عقل کو مختل و ماؤف کرتی نہ اس سے انسان پر اس طرح کا اثر پڑتا جس کا اثر اچانک کسی درندہ یا خوفناک سانپ کو دیکھ لینے سے پڑتا ہے کہ آدمی بھاگ کھڑا ہو اور پھر مڑنے کا نام بھی نہ لے۔ بلکہ اس کا اثر یہ پڑتا ہے کہ وہ خدا سے ڈر کر خدا ہی کی طرف بھاگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ خدا کی پکڑ سے خدا ہی پناہ دے سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ چنانچہ وہ، جیسا کہ حدیث ماثور میں ہے: اَللّٰهُمَّ

اِنِّیْ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْکَ[1] (اے رب! اور میں تجھ سے تیری ہی پناہ چاہتا ہوں) کہتا ہوا اس طرح اپنے آپ کو اپنے رب کی پناہ میں دے دیتا ہے جس طرح بچہ ماں کے ڈرانے سے ماں ہی کی آغوش سے چپٹ جاتا ہے۔ جو لوگ خدا سے بھاگ کر کسی دوسرے کی پناہ ڈھونڈتے ہیں وہ وہی غلطی کرتے ہیں جو حضرت نوحؑ کے بیٹے نے کی۔ جب باپ نے اس کو قہرِ الٰہی سے بچانے کے لیے کشتی میں سوار ہو جانے کی دعوت دی تو وہ گھمنڈ سے بولا کہ میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے اس طوفان سے بچا لے گا لیکن اس کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ خدا کی پکڑ سے کوئی پہاڑ پناہ نہیں دے سکتا۔

اس تاثر کا ایک دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے کہ یہ ایک ہی خوف دوسرے تمام خوفوں اور اندیشوں سے بالکل نچنت کر دیتا ہے۔ بندہ خدا سے ڈر کر جب اپنے تئیں اسی کی پناہ میں دے دیتا ہے تو اس کو یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی پناہ میں ہے جس کے سوا نہ کوئی نافع ہے نہ کوئی ضار۔ وہ جو کچھ دینا چاہے گا اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور جو روک لے گا کوئی اس کو دے نہیں سکتا۔ یہ اطمینان جس کو حاصل ہو گیا اس کو اس دنیا میں آسمانی بادشاہی حاصل ہو گئی۔ جنت کی تعریف میں فرمایا ہے کہ اس میں نہ کوئی خوف ہو گا نہ کوئی غم۔ یہی حال اس دنیا میں اس شخص کا ہوتا ہے جس کا دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے آشنا ہو گیا۔ یہ خوف تو اس کو بے شک لاحق رہتا ہے کہ ایک دن اس کو اپنے رب کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے، لیکن یہ خوف دل کو توڑنے والا نہیں، بلکہ اس کے لیے سرمایۂ اطمینان و تسکین ہے۔ اس لیے کہ یہ دوسرے

---

[1] صحیح مسلم: کتاب الصلوٰۃ، باب ۴۲

تمام دہی اندیشوں کو یک قلم ختم کر دیتا ہے۔

خوفِ الٰہی کے یہ صرف دو نمایاں اثرات ہم نے بیان کیے ہیں، قرآن و حدیث میں اس کے اثرات کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ اتنی طویل ہے کہ اس مختصر مضمون میں اس کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔ ہم اس کو چند کلیات کے تحت بیان کرتے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین ان کے تحت ان جزئیات کا بھی احاطہ کرنے کی کوشش کریں گے جو ان کے اندر مضمر ہیں۔

قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خوف لازماً انسان کو اس کی شخصی و ذاتی زندگی میں متّقی، اس کی عائلی و خاندانی زندگی میں مشفق اور اس کی اجتماعی زندگی میں ایک مصلح بنا دیتا ہے اور یہ اس کے ایسے بدیہی اثرات ہیں کہ اگر کسی میں نہ پائے جائیں یا کامل طور پر نہ پائے جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا سینہ یا تو خوفِ خدا سے خالی ہے اگرچہ وہ اس کا کتنا ہی مدّعی ہو، یا وہ خدا اور اس کے خوف کے تصور سے بالکل ناآشنا ہے۔

اب اس اجمال کی وضاحت کے طور پر چند باتیں ذہن نشین کر لیجیے۔ اپنی شخصی و انفرادی زندگی میں متّقی کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مخفی سے مخفی گوشوں میں بھی خدا کے حدود و محارم کی پوری پوری نگہداشت کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جہاں اس کو کوئی نہیں دیکھتا وہاں بھی خدا کی نگاہوں سے وہ مخفی نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے وہ کبھی بھی اپنی خواہشوں کو ایسی آزادی نہیں دیتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی کسی حد سے تجاوز کر پائیں۔ اس کے ہر عمل میں احتیاط کی یہ شان نمایاں ہوتی ہے کہ وہ صرف برائی ہی نہیں بلکہ برائی کے قرب سے بھی اپنے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تنبیہ ہمیشہ اس کے سامنے رہتی ہے کہ جو چرواہا اپنا گلہ کسی کے رقبہ کے اردگرد چراتا ہے ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اس کا گلہ کھیتوں

میں جا پڑے۔ یہ اندیشہ متقاضی ہوتا ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کی باگ برابر کھینچے رہے۔ اس کو ہر لمحہ یہ خوف ہی دامن گیر رہتا ہے کہ ایک دن اس کو اپنے رب کی عدالت میں کھڑے ہونا اور اپنے ہر قول و فعل کی جواب دہی کرنا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے باب میں ارشاد ہے :

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ	اور جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرا
وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ	اور جس نے اپنے نفس کو خواہش کی پیروی
فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰىؕ	سے روکا تو اس کا ٹھکانا لاریب
(النّٰزِعٰت - ۷۹ : ۴۰-۴۱)	جنت ہے۔

اپنی عائلی و خاندانی زندگی میں مشفق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آل و اولاد اور اپنے کنبہ و خاندان کو اپنے لیے سرمایۂ فخر و غرور نہیں سمجھتا بلکہ اَلَاکُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ[1] (آگاہ ہو کہ تم میں سے ہر شخص چرواہا بنایا گیا ہے اور ہر شخص سے اس کے گلّہ کے بارے میں پرسش ہونی ہے) کی تنبیہ کی روشنی میں وہ اپنی اس ذمہ داری کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جو گلّہ اس کی تحویل میں دیا گیا ہے اس کی ایک ایک بھیڑ سے متعلق اس سے پرسش ہونی ہے کہ اس نے اس کی دیکھ بھال کا حق ادا کیا یا نہیں؟ یہ احساسِ ذمہ داری کا قدرتی تقاضا ہے کہ بجائے اس کے کہ اس کو اپنے گلّہ کی وسعت پر ناز و فخر ہو برابر فکر اس کو اس بات کی دامن گیر رہتی ہے کہ کوئی بھیڑ آوارہ ہو کر بھیڑیے کی نذر نہ ہو جائے کہ مالک کی طرف سے اس کی بابت پرسش ہو اور وہ ایک نالائق چرواہا ٹھہرے۔ چنانچہ وہ اپنے خاندان کو دیکھ کر اتراتا اور اکڑتا نہیں بلکہ برابر اس فکر میں رہتا ہے کہ ان کی ہدایت و ضلالت سے متعلق اس پر جو ذمہ داریاں

---

[1] صحیح مسلم: کتاب الامارۃ، باب ۵

عائد ہوتی ہیں ان کو ادا کرنے کی اس کو توفیق حاصل ہو تاکہ قیامت کے دن اس کو فاسقوں کے سردار کی حیثیت سے اٹھنے کی رسوائی نہ حاصل ہو، بلکہ وہ متقیوں کے امام کی حیثیت سے اٹھے۔ اس طرح فکرمند رہنے والوں کے باب میں قرآن نے یہ خبر دی ہے کہ ان کو اور ان کے صالح متعلقین کو جنت میں براجمان دیکھ کر جب سوال کرنے والے یہ سوال کریں گے کہ آپ کو یہ مقام کس نیکی کے صلے میں ملا تو جواب دیں گے:

اِنَّا کُنَّا قَبْلُ فِیْٓ اَھْلِنَا مُشْفِقِیْنَ ہ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَ وَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ' (الطور ۔ ۵۲ : ۲۶ ۔ ۲۷) (ہم اس سے پہلے اہل و عیال کے باب میں بڑے ہی چوکنے رہے ہیں تو اللہ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا اور ہمیں عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھا) یعنی ہم نے دنیا میں اپنے اہل و عیال کے اندر دنیا کے بدمستوں کی طرح بے فکری کی زندگی نہیں گزاری بلکہ اس ڈر سے کہ ایک دن ان کے خیر و شر سے متعلق ہمیں خدا کے آگے جواب دہی کرنی ہے ہم نے ان کی دنیا سے زیادہ ان کی عاقبت کی فکر رکھی جس کا صلہ ہم کو یہ ملا ہے۔

قومی و ملی زندگی میں مصلح کا مطلب یہ ہے کہ خوفِ خدا رکھنے والے اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں کہ جو شخص اپنی قوم کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق زندگی گزارتا ہے جب اس کی قوم اپنے اجتماعی فساد کے نتیجے میں خدا کی پکڑ میں آتی ہے تو لازماً وہ لوگ بھی اس عذاب کی زد میں آتے ہیں جو اگرچہ خود مفسد نہ رہے ہوں لیکن انہوں نے مفسدوں کی اصلاح کی کوئی کوشش بھی نہ کی ہو۔ قوموں کے معاملہ میں سنتِ الٰہی یہ ہے کہ ان کی عدالت اسی دنیا میں ہو جاتی ہے اور جب اس عدالت کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے غضب سے صرف وہی لوگ بچتے ہیں جنہوں نے تمام مخالفتوں اور عداوتوں سے بے پروا ہو کر بے خوفِ لامتِ لائم، قوم کو گمراہی سے بچانے کی کوشش کی ہو۔ جو لوگ اپنے مصالح کی خاطر اس طرح کے معاملات کو پرایا جھگڑا سمجھ کر ان سے

الگ تھلگ رہتے ہیں وہ اگرچہ خود اپنی نگاہ میں نیک ہوں لیکن ان کا حشر وہی ہوتا ہے جو ایک کشتی کے مسافروں والی تمثیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا ہے کہ اگر کشتی کے نیچے والے حصہ میں سفر کرنے والے کشتی کے پیندے میں سوراخ کرنا شروع کر دیں اور اوپر والے اس خیال سے ان کے ہاتھ نہ پکڑیں کہ یہ ایک پرایا جھگڑا ہے، اس میں ان کو مداخلت کا کیا حق ہے، تو اس کے نتیجے میں کشتی جب ڈوبے گی تو سب کو لے ڈوبے گی، اوپر والوں کو بھی اور نیچے والوں کو بھی۔

اس سعیِ اصلاح کی حد قرآن نے یہ مقرر کی ہے کہ اگر اصلاح کرنے والوں کی یہ بات ایک شخص بھی سننے والا نہ ہو جب بھی انہیں اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا عذر مسموع ہو سکے۔ قرآن میں مصلحین کے ایک گروہ کا ذکر ہوا ہے کہ جب ان کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں نے، حالات سے بددل ہو کر یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ آخر ایسے لوگوں کے پیچھے اپنی اوقات رائگاں کرنے سے کیا حاصل جو کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں تو ان کے ذی علم ساتھیوں نے ان کو جواب دیا کہ "مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ" (الاعراف - ۷، ۱۶۴) (یہ اس لیے کہ یہ تمہارے رب کے سامنے ہماری طرف سے عذر بن سکے)۔ یعنی ہمیں یہ جدوجہد اس لیے جاری رکھنی چاہیے کہ ہمارے رب کے سامنے ہمارا عذر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ہمارا جو فرض تھا وہ ہم نے ادا کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قوم کی اصلاح سے متعلق جو ذمہ داری اس کے صالح افراد پر عائد ہوتی ہے وہ کوئی سرسری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ جان کی بازی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے ہاں بری الذمہ وہی لوگ قرار پائیں گے جو زندگی کے آخری لمحات تک تمام خطرات سے بے پروا ہو کر یہ بازی کھیلیں گے۔

ایک ضروری تنبیہ:

آخر میں ایک تنبیہ بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اگر انسان خوف اور رجا میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم نہ رکھ سکے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو وہ استوار نہیں رکھ سکتا۔ ضروری ہے کہ یہ دونوں چیزیں نہایت تناسب کے ساتھ اس کے اندر موجود ہوں۔ قرآن نے ان دونوں کو برابر کی نسبت کے ساتھ ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (الاعراف۔۷:۵۶) (اور اس کو پکارو بیم ورجا دونوں حالتوں میں)۔ یہ تناسب اس لیے ضروری ہے کہ اگر آدمی پر خوف کا زیادہ غلبہ ہو جائے تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہو جائے جو درحقیقت کفر ہے۔ یہ مایوسی انسان کو شیطان کے لیے نہایت آسان شکار بنا دیتی ہے وہ اس کو بھٹکا کر دوسرے دروازوں پر ڈال دیتا ہے اور وہ شرک کے جال میں پھنس کر تباہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اگر اس پر رجائیت کا زیادہ استیلاء ہو جائے تو اس سے وہ اس فتنہ میں مبتلا ہو جاتا ہے جس میں یہود مبتلا ہو گئے کہ وہ جرائم پر جرائم کرتے چلے جاتے اور سمجھتے کہ 'سَيُغْفَرُ لَنَا' (الاعراف۔۷: ۱۶۹) (ہمارے لیے سب معاف کر دیا جائے گا) یعنی ہم خدا کے برگزیدوں کی اولاد ہیں، جس طرح اب تک اس نے درگزر فرمایا ہے اسی طرح آئندہ بھی درگزر فرمائے گا۔ اسی رجائیت کے بطن سے مرجئیت بھی پیدا ہوتی ہے جو اس دور کا عام دین ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مغفرت حاصل کرنے کے لیے چند باتوں کا زبانی اقرار کافی ہے۔ اعمال کی اہمیت ان کے نزدیک اول تو کچھ ہے نہیں اور اگر ہے بھی تو بہرحال اتنی نہیں ہے کہ ان کے اوپر نجات کا انحصار ہو۔

حیا

ایمان کے تقاضوں میں سے جس طرح خوف اور محبت ہیں، جن کی تفصیل پچھلے ابواب میں گزر چکی ہے، اسی طرح اس کے بدیہی تقاضوں میں سے حیا بھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: 'الحیاء شعبة من الایمان'[1] (حیا ایمان کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے)۔

یہاں حیا سے ہماری مراد وہ حیا نہیں ہے جو فطری تقاضوں کے تحت ہم آپس میں ایک دوسرے سے بعض معاملات میں کرتے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ حیا ہے جو ایک بندہ اپنے رب سے کرتا ہے۔ یہی حیا اس حیا کا بھی اصل منبع ہے جو ہم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ اگر یہ حیا ہمارے اندر سے مٹ جائے تو وہ حیا بھی بالآخر مٹ کے رہتی ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں حسن و جمال پیدا کرتی ہے اور اگر الف و عادات کے تحت ظاہر میں اس کے کچھ آثار باقی رہتے ہیں بھی تو اس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے وہ کسی باد مخالف کا مقابلہ نہیں کر سکتی، بلکہ معمولی جھٹکا بھی اس کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کے پھینک دیتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ۱۲

ہیں کہ اس زمانے میں خدا سے ناآشنا معاشروں کی بے حیائی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ تہذیب و تمدن کے ادعا کے باوجود، ان کی پارلیمنٹیں ایسے گھنونے جرائم کو قانونی جواز کی سند دے رہی ہیں جن کا کل تک شریف لوگ تصور نہیں کر سکتے تھے[1]۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ان کی حیا کا تعلق اصل منبع سے نہیں تھا، بلکہ اس کی بنیاد مجرد رسوم و روایات پر تھی۔ اس وجہ سے رجحانِ عام کی تبدیلی کا مقابلہ وہ نہ کر سکی، بلکہ بدلتے ہوئے حالات سے اس کو شکست کھانی پڑی۔ غالباً یہی مطلب ہے اس حکیمانہ قول کا جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سابق انبیائے کرام کی وراثت قرار دیا ہے۔ یعنی "اذا لم تستحي فاصنع ما شئت"[2] (یعنی جب تم میں خدا کی شرم باقی نہیں رہی تو جو چاہو کرو)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی شرم ہی انسان کو برائیوں سے بچانے والی ہے۔ جب یہ شرم اٹھ گئی تو کوئی برائی بھی انسان سے بعید نہیں رہی۔

یہ حیا انسان کی زندگی پر گوناگوں پہلوؤں سے اثرانداز ہوتی اور اس کو شیطان کے فتنوں سے بچاتی ہے۔ اس کی اس ہمہ گیری کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں اشارہ فرمایا ہے۔ جامع ترمذی میں مرفوعاً روایت ہے:

عن عبد اللہ بن مسعود قال:	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،	ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
استحیوا من اللہ حق الحیاء،	کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح شرم کرو جس
قال: قلنا یا رسول اللہ! انا	طرح اس سے شرم کرنے کا حق ہے۔ لوگوں

---

[1] میں یہاں برطانوی پارلیمنٹ کے بعض قوانین کا حوالہ دینا چاہتا تھا جو حال میں اس نے پاس کیے ہیں، لیکن شرم ان کے ذکر سے مانع ہے۔

[2] صحیح البخاری، کتاب الانبیاء، باب ۵۴

نستحیی والحمد للہ، قال:	نے عرض کی، یارسول اللہ! ہم شرماتے تو
لیس ذالک، ولکن الاستحیاء	ہیں، اللہ کا شکر ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ وہ
من اللہ حق الحیاء ان	چیز نہیں ہے۔ جو اللہ سے اس طرح شرمائے
تحفظ الرأس وما وعی،	جس طرح اس سے شرمانے کا حق ہے اس
والبطن وما حوی ولتذکر	کو چاہیے کہ وہ اپنے دماغ کا اور جو کچھ وہ اس
الموت والبلی، و	میں جمع کرتا ہے اس کا خیال رکھے، اپنے
من اراد الآخرۃ ترک زینۃ	پیٹ کا اور جو کچھ اس میں بھرتا ہے اس پر
الدنیا، فمن فعل	نگاہ رکھے، اپنی موت کو اور اس کے بعد
ذالک فقد استحیا	مرنے اور گلنے کو یاد رکھے اور جو آخرت کا
من اللہ حق الحیاء[1]	طالب ہوتا ہے وہ دنیا کی زینتوں کو خیرباد
	کہتا ہے۔ تو جس نے یہ کام کیے درحقیقت
	وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے اسی طرح شرماتا ہے
	جس طرح اس سے شرمانے کا حق ہے۔

حیا کے اصل عوامل:

اللہ تعالیٰ سے حیا پیدا کرنے میں اصل عامل کی حیثیت اس کی صفات کو ہے۔ جو بندہ اس کی صفتوں کو اچھی طرح جانتا اور ان پر مضبوط ایمان اور ان کا استحضار رکھتا ہے وہی اس سے صحیح معنوں میں شرماتا ہے۔ جو اس کی صفتوں سے بے خبر ہیں یا ان کی یادداشت کے لیے وہ اہتمام نہیں کرتے جو کرنا چاہیے ان کے اندر نہ خدا سے کسی شرم

[1] جامع ترمذی: کتاب صفۃ القیامۃ، باب: ۲۴

کا احساس ہوتا ہے نہ بندوں سے۔ ان کی مثال حیوانات کی ہے جو شرم کے احساس سے یک قلم عاری ہیں۔

یہ مسئلہ دقیق ہے، اس وجہ سے ہم چند مثالوں سے یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کی کن صفات کا استحضار آدمی کے اندر اس سے حیا پیدا کرتا ہے اور ان کی اثر انگیزی کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔

صفاتِ الٰہی میں سے سب سے زیادہ مؤثر صفات، جو انسان کے اندر خدا سے حیا کے شعور کو بیدار کرتی ہیں۔ وہ اس کے احاطۂ علم کی صفات ہیں جو بندہ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہر قول و فعل کی نگرانی کر رہا ہے: اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ رَقِیۡبًا (النساء - ۴ : ۱) (بے شک اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے)، جس کو اس حقیقت کا علم ہے کہ وہ نگاہوں کی خیانتوں اور سینے کے ہر راز سے باخبر ہے: یَعۡلَمُ خَآئِنَۃَ الۡاَعۡیُنِ وَمَا تُخۡفِی الصُّدُوۡرُ (المؤمن - ۴۰ : ۱۹) (وہ نگاہوں کی چوری بھی جانتا ہے اور ان بھیدوں کو بھی جو سینے چھپائے ہوئے ہیں)، جو اچھی طرح جانتا ہے کہ آدمی جہاں کہیں بھی ہو اللہ تعالیٰ ہر جگہ اس کے ساتھ ہے، محفوظ سے محفوظ خلوت خانوں میں بھی کوئی سرگوشی ہو رہی ہو تو وہ وہاں بھی موجود ہوتا ہے: مَا یَکُوۡنُ مِنۡ نَّجۡوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ہُوَ رَابِعُہُمۡ وَلَا خَمۡسَۃٍ اِلَّا ہُوَ سَادِسُہُمۡ وَلَاۤ اَدۡنٰی مِنۡ ذٰلِکَ وَلَاۤ اَکۡثَرَ اِلَّا ہُوَ مَعَہُمۡ اَیۡنَ مَا کَانُوۡا ۚ (المجادلۃ - ۵۸ : ۷) (نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین کے درمیان مگر ان کا چوتھا اللہ ہوتا ہے اور نہ پانچ کے مابین مگر چھٹا وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم یا زیادہ کی مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں)۔ ان باتوں پر ایمان رکھنے والے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی مخفی سے مخفی گوشے میں بھی وہ کسی ایسی بات کا ارتکاب کر سکے جو اس کے رب کے سامنے اس کو شرمندہ

کرنے والی ہو۔ وہ کسی ایسے مقام کا تصور نہیں کر سکتا جہاں اس کو خدا نہ دیکھ سکے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ جہاں بھی کوئی گناہ کرے گا عین اپنے رب کے سامنے کرے گا۔ یہ جسارت ظاہر ہے کہ کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو انتہائی بے شرم ہو یا انتہائی بے خوف ہو۔ اسی طرح کے لوگوں کے بارے میں سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے:

'بَلْ یُرِیۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِیَفۡجُرَ اَمَامَہٗ' (القیمۃ - ۷۵: ۵) (بلکہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ عین اللہ کے سامنے شرارت کرے)۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہایت غیور ہے۔ قدیم صحیفوں میں یہ صفت بار بار اللہ تعالیٰ کے لیے آئی ہے۔ اس کا تقاضا یہ بیان ہوا ہے کہ خداوند خدا، تمہارا خدا غیور ہے، جس طرح تم یہ گوارا نہیں کرتے کہ تمہاری بیوی غیر کی بغل میں سوئے اسی طرح وہ بھی یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کا بندہ کسی غیر کی عبادت کرے، ہمارے نزدیک یہی مضمون ذرا مختلف الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے:

یا امۃ محمد! ما من احد اغیر من اللہ ان یزنی عبدہٗ او تزنی امتہٗ[1]	اے امتِ محمد! اس معاملہ میں کوئی اللہ تعالیٰ سے زیادہ غیور نہیں ہے کہ اس کا بندہ زنا کا مرتکب ہو یا اس کی کوئی بندی زنا کرائے۔

قدیم صحیفوں اور قرآن مجید میں زنا اور شرک، دونوں کو بالکل مماثل جرم قرار دیا گیا ہے اس وجہ سے ہمیں خیال ہوتا ہے کہ اس حدیث میں لفظ "زنا" اپنے حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ان دونوں کی مشابہت پر ہم نے تفسیر تدبر قرآن

---

[1] مؤطا امام مالک: کتاب الصلوٰۃ، باب العمل فی صلاۃ الکسوف

میں بحث کی ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفت متکبر درحقیقت صفتِ غیور کی ایک جامع تعبیر ہے۔

اس کا تیسرا نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ اس دنیا میں اپنے رب کی جو شانیں اور عظمتیں ہم ہر وقت دیکھتے ہیں ان کے دیکھتے ہیں اپنے بارے میں یہ خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ہم بہت بڑی چیز ہیں۔ جس زمین پر ہم چلتے ہیں اس کی وسعتوں کا حال یہ ہے کہ اس کے اندر ہماری حیثیت ایک چیونٹی اور ایک مکھی سے زیادہ نہیں ہے۔ جن پہاڑوں کے نیچے ہم رہتے ہیں ان کی بلندی آسمانوں کو چھوتی ہے اور ہم ان کے آگے ایک ذرۂ ناچیز کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ جن سمندروں سے ہم گھرے ہوئے ہیں ان کے مقابل میں ہمارا وجود ایک قطرے کے برابر بھی نہیں۔ اس ماحول میں اگر ہم اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھ کر اپنے اوپر فخر کرنے لگ جائیں اور اس زمین پر اترا کر چلیں تو اس کی مثال ایسی ہی ہوگی کہ کوئی چیونٹی غرور میں مبتلا ہو کر زمین پر پاؤں مار کے چلے۔ ایک قصہ ہے کہ کوئی مکھی ایک بیل کے سینگ پر جا بیٹھی۔ بیل کو بھلا اس کا کیا احساس ہوتا لیکن مکھی اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ رہی تھی۔ اس وجہ سے اس نے کچھ دیر کے بعد نہایت بزرگانہ انداز میں بیل سے پوچھا کہ اگر تمہاری گردن میرے بوجھ سے ٹوٹی جا رہی ہو تو میں یہاں سے اڑ جاؤں۔ بیل نے اس کو جواب دیا کہ آپ شوق سے تشریف رکھو مجھے تو اب خبر ہوئی ہے کہ آپ میری سینگ پر تشریف فرما ہیں! اسی روایتی مکھی کی طرح بہت سے لوگ اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ بیٹھتے ہیں جس سے ان کی چال میں ایک شانِ کبریائی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ چلتے ہیں تو زمین پر پاؤں دھمکتے ہوئے چلتے ہیں۔ گردن ٹیڑھی اور اونچی رکھتے ہیں۔ بولتے ہیں تو کرخت لب و لہجہ میں بولتے ہیں۔ اس طرح کے بر خود غلط لوگوں کے اندر احساسِ شرم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو آگاہ فرمایا ہے کہ

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا (بنی اسرائیل ۱۷ : ۳۷) (اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کے طول کو پہنچ سکتے ہو)۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم خدا کی یہ عظیم شانیں اور قدرتیں دیکھتے ہو جن کے آگے تم ایک ذرۂ ناچیز ہو تو تمہیں اس کی زمین میں سر اونچا کرنے سے شرمانا چاہیے۔ ایاز قدرِ خود بشناس!

اس احساسِ شرم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کو یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کے پاس جتنی قوتیں اور صلاحیتیں اور جتنے اسباب و وسائل ہیں سب اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے ہیں۔ ان میں سے نہ کسی چیز کا وہ خالق ہے اور نہ خدا کی عنایت کے بغیر ان کو قائم ہی رکھ سکتا ہے۔ اگر یہ حقیقت برابر اس کے پیش نظر رہے تو لازماً یہ شرم بھی برابر دامن گیر رہے گی کہ کوئی ناشکری یا نافرمانی یا سرکشی اس سے صادر ہوئی تو لازماً وہ انھی قوتوں یا صلاحیتوں اور انھی اسباب و وسائل کے ذریعہ ہوگی جو خدا کے بخشے ہوئے ہیں جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوتے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں اس کو اس لیے بخشیں کہ وہ اس کا شکر گزار اور فرماں بردار بندہ بن کر زندگی گزارے وہ اس نے اس سے بغاوت اور غداری کے لیے استعمال کیں۔ گویا غلام نے آقا کے بخشے ہوئے آلات واردات سے آقا ہی کے گھر میں نقب لگائی۔ نعمتوں کے شعور کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے شرم ساری کا یہ احساس ایک امر فطری ہے جس کے اندر یہ احساس نہ ہو وہ ایک کمینہ اور لئیم انسان ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف اتنی کثرت سے توجہ دلائی ہے کہ اس کے حوالے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بعض لوگ اپنے دین داری کے کاموں کو بڑی اہمیت دے بیٹھتے ہیں اور اپنے زعم میں وہ اللہ اور رسول کے محسن بن جاتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی جو اپنے رب کے حضور میں کوئی پیش کرتا ہے

کیا اس کی اپنی ہوتی ہے؟ اگر اس نے اپنا سارا مال خدا کی راہ میں لٹا دیا تو یہ مال خدا ہی کا دیا ہوا تھا۔ اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ اس نے اپنی صلاحیت وقابلیت سے حاصل کیا تھا تو اسے یہ بھولنا نہ چاہیے کہ یہ قابلیت و صلاحیت بھی کوئی اپنے گھر سے نہیں لاتا، بلکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی بخشتا ہے۔ مال تو درکنار اگر کوئی شخص اپنی جان بھی، جس سے بڑی انسان کے پاس کوئی اور چیز نہیں ہے اللہ کی راہ میں قربان کر دے تو اس پر بھی فخر کے بجائے اعترافِ تقصیر ہی کرنا چاہیے کہ ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہی اعترافِ تقصیر وخجالت بندے کا اصل سرمایہ اور یہی تمام عبادت و اطاعت کی روح ہے۔ قرآن میں بھی اس کی طرف اشارات ہیں اور بعض عارفوں نے بھی اس کا اظہار کیا ہے۔ قرآن میں منافقین کے متعلق بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ اور رسول کا محسن سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام لائے ہیں۔ ان کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جواب دلوایا گیا ہے کہ تم میرے اوپر احسان نہ جتاؤ کہ تم اسلام لائے، بلکہ یہ تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے تمہاری رہنمائی اسلام کی طرف فرمائی۔

اس خصلت کی تربیت کا طریقہ:

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ جب اس حیا کی دین میں یہ عظمت واہمیت ہے تو اپنے اندر اس کے پیدا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اس کا جواب ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ اس کی تربیت میں اصل عامل کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی صفات کو حاصل ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ جو شخص اس صفت کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے

وہ اپنے دل و دماغ کے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کو برابر مستحضر رکھنے کی ممارست کرے۔ یہ کام نہایت دقیق اور مشکل ہے اس لیے کہ ان صفات کا استحضار پورے شعور کے ساتھ مطلوب ہے۔ صرف اتنی چیز اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہوگی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کو یاد کر چھوڑیں اور خاص خاص اوقات میں ان کا ورد کر لیا کریں۔ ثواب کے پہلو سے چاہے اس کی کچھ اہمیت ہو لیکن پیش نظر مقصد کے لیے یہ چیز بے سود ہوگی۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ان اسمائے حسنیٰ کا جو عکس انسان کی زندگی پر پڑنا چاہیے وہ عکس ہر زاویہ سے پڑے۔ تزکیہ کے نصب العین کے لیے اصل مطلوب شے یہی ہے اور یہ چیز قرآن و حدیث کے تدبر کے سوا اور کسی راہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی دو چیزیں ایسی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا ربط انسان کی زندگی کے ساتھ پوری طرح واضح کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے ان کا عمیق مطالعہ اس مقصد کے لیے ضروری ہے۔

اگر اس جہاد کا حوصلہ کوئی شخص نہ کر سکتا ہو تو پھر ادنیٰ درجے میں وہ یہ طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہے کہ ان لوگوں کی معیت و رفاقت تلاش کرے جو اس صفت کے حامل ہوں۔ اچھی صحبت بڑی نعمت ہے بشرطیکہ حاصل ہو سکے اور اگر حاصل ہو جائے تو آدمی اس کو نباہ سکے۔ اگرچہ ایسی صحبت کا حصول کچھ مشکل نہیں ہے۔ لیکن حق کے طالبوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا۔ اس وعدے پر اعتماد کر کے جو شخص پورے عزم و خلوص کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوگا امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کسی خضرِ راہ سے ملا دے گا:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ	اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔
(العنکبوت - ۲۹ : ۶۹)	

یہ صفت ایک بڑی گراں بہا متاع ہے۔ اس کی شان میں حدیث نبوی

ہے کہ، فاستحی اللہ منہ[1]، (پس وہ اللہ سے شرمایا تو اللہ بھی اس سے شرمایا)۔ حضورؐ کے اس ارشاد کے معانی و حقائق پر علماء نے بہت کچھ لکھا ہے، لیکن تمام موشگافیوں سے صرفِ نظر کر کے اگر اس کا مطلب صرف اتنا ہی لیا جائے کہ اللہ تعالٰے ایسے بندے کی دعاؤں کو رد کرنے سے شرماتا ہے تو یہی اتنی بڑی دولت ہے کہ اس کے حاصل کرنے کے لیے اگر انسان اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دے تو یہ اس کی سب سے بڑی خوش بختی ہو گی۔

---

[1] صحیح مسلم: کتاب السلام، باب ۱۰

وفا

حیا کی طرح وفا بھی ایمان کے لازمی اور بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔ وفا سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اپنے رب سے جو عہد و میثاق کیے ہیں وہ پوری راست بازی کے ساتھ پورے کریں۔ یہ امر واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق دو مضبوط میثاقوں پر قائم ہے۔ ایک وہ میثاق ہے جو اس نے ہمارے پیدا کرنے سے پہلے ہماری ارواح سے لیا ہے اور جس کا ذکر سورۂ اعراف میں ہوا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۙ	اور یاد کرو، جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے ــــ ان کی پیٹھوں سے ــــ ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے: ہاں، تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔
(الاعراف - ۷ : ۱۷۲)	

عہدِ فطرت :

یہی وہ عہد ہے جس کو قرآن نے عہد فطرت سے بھی تعبیر فرمایا ہے :

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ	اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔

(الروم - ۳۰ : ۳۰)

اس عہد میں جس طرح توحید کا اقرار شامل ہے اسی طرح تمام بنیادی نیکیوں کے نیکی اور تمام بڑی برائیوں کے برائی ہونے کا شعور بھی شامل ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے خود انسان کے نفس کو اس کے اوپر ایک حجت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورۂ شمس میں فرمایا ہے :

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۙ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۙ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۙ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ؕ	اور شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا، پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔

(الشمس - ۹۱ : ۷-۱۰)

اسی عہدِ فطرت کی بنا پر ہر سلیم الحواس انسان توحید اور بنیادی نیکیوں اور بدیوں سے متعلق، قیامت کے دن مسئول ہوگا۔ خواہ اس کو کسی نبی کی دعوت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے ہر انسان پر حجت تمام کر دی ہے۔ جس کے بعد کوئی شخص، جیسا کہ سورۂ اعراف کی مذکورہ بالا آیت سے واضح ہے، یہ نہیں کہہ سکتا کہ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ (الاعراف - ۷ : ۱۷۲) ہم تو ان باتوں

سے بے خبر ہی رہے)۔

قرآن کے نزدیک اس عہدِ فطرت کا اذعان ویقین انسان کے اندر اتنا محکم ہے کہ کوئی شخص اپنے رب کی کوئی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عین اس کے سامنے اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے: بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ' (القیامۃ - ۷۵: ۵) (بلکہ انسان چاہتا ہے کہ عین اپنے رب کے سامنے اس کی نافرمانی کرے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کا اپنا ضمیر خدائی کوتوال کی حیثیت سے اس کو عہدِ فطرت کی یاددہانی کرتا رہتا ہے اور خود اپنے ضمیر کی یہ تنبیہ کوئی دوسرا سنتا ہو یا نہ سنتا ہو، لیکن آدمی خود اس کے سننے سے قاصر نہیں رہتا اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے ' بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ' (القیامۃ - ۷۵: ۱۴-۱۵)

(بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

اگرچہ ایک بہانہ باز یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کو نہ تو اس طرح کا کوئی عہد ہی یاد ہے اور نہ وہ اپنے اندر اس طرح کی کوئی خلش ہی محسوس کرتا جس کو ضمیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن آدمی سے اپنا باطن پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ایک نفسِ لوّامہ چھپا ہوا ہے جو اس کو اس کی ہر خلافِ ضمیر حرکت پر اس وقت تک سرزنش کرتا رہتا ہے جب تک وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے اس کی زبان بالکل ہی بند نہ کر دے۔

باطن کی یہ آواز کسی خارجی دلیل وشہادت کی محتاج نہیں ہوتی ہے۔ اس کی دلیل وشہادت خود اس کے اندر ہی ہوتی ہے۔ خارج کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی اس سے زیادہ واضح نہیں ہے کہ اس سے اس پر دلیل قائم کی جاسکے۔ اس کی دلیل بس یہ ہے کہ انسان اس کو اپنے اندر پا رہا ہے اور ایسے تواتر وتسلسل اور ایسی وضاحت و

قطعیت کے ساتھ پارہا ہے کہ اس کی کسی طرح بھی تکذیب نہیں کرسکتا الا آنکہ وہ ہٹ دھرمی سے کام لے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مشہور فلسفی کانٹ نے اس اندرونی آواز (INNER VOICE) کو فلسفہ و منطق کے طریقِ احتجاج و استدلال کی گرفت سے بالکل بالاتر قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی یہ بات نہایت گہری حکمت پر مبنی ہے۔

یہ بات کہ انسان بدی کے بدی ہونے اور نیکی کے نیکی ہونے سے ازروئے فطرت واقف ہے یوں بھی ثابت ہے کہ اگرچہ وہ خود دوسروں کے ساتھ بدی کرتا ہے، لیکن وہی بدی اگر دوسرا اس کے ساتھ کرے تو اس کو ظلم و نا انصافی ٹھہراتا اور اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ نیکی اور بدی کے شعور سے عاری نہیں ہے، لیکن خود فریبی کے سبب سے اپنے لیے تو دوسروں سے وہ نیکی چاہتا ہے، لیکن دوسروں کے ساتھ بدی کی آزادی کا بھی خواہاں ہے۔ سورۂ مطففین میں قرآن نے اس کی اس کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۙ الَّذِينَ	بُرا ہو، ناپ تول میں کمی کرنے والوں
إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ	کا! جو دوسروں سے نپوائیں تو پورا نپوائیں
يَسْتَوْفُونَ ۖ وَإِذَا كَالُوهُمْ	اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں
أَوْ وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۗ	تو اس میں کمی کریں۔

(المطففین - ۸۳: ۱-۳)

میثاقِ شریعت:

اگرچہ انسان پر حجت قائم کرنے اور اس کو مستوجب جزا و سزا قرار دینے کے لیے یہ عہدِ فطرت بھی کافی تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر مزید یہ فضل فرمایا کہ اپنے

نبی اور رسول بھیج کر اور اپنی شریعت نازل کر کے اس عہدِ فطرت کو بالکل واضح اور مبرہن اور ہر پہلو سے جامع و مکمل بھی کر دیا کہ کسی گمراہی میں پڑنے کے لیے کوئی رخنہ باقی نہ رہے تاکہ جو ہلاک ہو وہ اتمامِ حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندگی اختیار کرے وہ بھی دلیل کے ساتھ اختیار کرے:

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ	تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ
بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ	کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل
عَنْ بَيِّنَةٍ ط	کرنی ہے وہ حجت دیکھ کر زندگی
(الانفال - ۸: ۴۲)	حاصل کرے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ شریعت انسان کے لیے کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ عہدِ فطرت کے اوپر ایک دوسرا میثاق ہے جس نے سابق میثاق کو مزید مؤکد و موثق کر دیا ہے۔ جس سے گمراہی کی ہر راہ مسدود ہو گئی ہے دوسرے لفظوں میں اس کو یوں کہیے کہ شریعت کی حیثیت انسان کے لیے تاریکی کے اوپر روشنی کی نہیں، بلکہ روشنی کے اوپر روشنی کی ہے۔ جیسا کہ سورۂ نور میں ارشاد ہے: نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ (النور۔ ۲۴: ۳۵) (روشنی کے اوپر روشنی!) اس سے انسان کا باطن اور ظاہر، دونوں جگمگا اٹھتے ہیں اس کی تمثیل قرآن مجید میں یوں بیان ہوئی ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط	اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے
مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا	دل کے اندر اس کے نورِ ایمان کی تمثیل
مِصْبَاحٌ ط فِیْ زُجَاجَةٍ ط	یوں ہے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک
اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ	چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر
دُرِّیٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ	ہو، شیشہ ایک چمکتے تارے کی مانند
مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ	ہو۔ چراغ ایک ایسے شاداب درخت

وَلَا غَرْبِيَّةٍ لا يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ط (النور - ۲۴ : ۳۵)

زیتون کے روغن سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی ہو۔ اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا۔ روشنی کے اوپر روشنی!

شریعت کے عہدِ میثاق ہونے کا ذکر قرآن میں اتنی کثرت سے ہوا ہے کہ اس کے حوالے نقل کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ بعض عظیم سورتوں کا تو موضوع ہی اس میثاق کی عظمت واہمیت اور اس کی ذمہ داریوں کی توضیح وتفصیل ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری وفاداری کے ساتھ اس میثاق کی پابندی ہی پر بندوں کی دنیا اور آخرت، دونوں کی فلاح کا انحصار ہے۔ اس میثاق میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے حقوق اور فرائض، دونوں تفصیل سے بیان کردیے ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ بندے اپنے فرائض اگر وفاداری سے پورے کریں گے تو لازماً وہ اپنے حقوق اللہ تعالیٰ سے حاصل کریں گے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اگر اس کی خلاف ورزی کریں گے تو اس بے وفائی کی سزا اس عالم میں بھگتیں گے اور آخرت میں بھی۔

سورۂ مائدہ میں اس میثاق کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ لا اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ز وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (المائدة - ۵ : ۷)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جب کہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سینوں کے بھید تک سے بھی باخبر ہے۔

اس آیت میں 'نِعْمَةَ اللّٰهِ' سے مراد شریعتِ الٰہی ہے جو سب سے بڑے

فضل کی حیثیت سے اس امت کو حاصل ہوئی اور 'میثاق' سے مراد وہ عہدوپیمان ہے جو اس شریعت پر پوری راست بازی اور کامل وفاداری سے عمل کرنے اور عمل کرانے کا لیا گیا اور پوری امت نے 'سمعنا و اطعنا' کہہ کر اس عہد کی پابندی کا اقرار کیا۔ اگرچہ یہ اقرار اول اول امت کے ہراول دستہ یعنی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہی نے کیا، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی مخاطب وہی تھے، لیکن ہم بھی اس عہد و اقرار میں برابر کے شریک ہیں اگر ہم ان مقدس اسلاف کے خلف ہونے کے مدعی ہیں اور اس شرف سے محروم ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

وفاداری بشرطِ استواری:

اس دوہرے میثاق کی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ یہ بڑے جان جوکھم کا کام ہے۔ اس میں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہیں جن سے صرف وہی عہدہ برآ ہوتے ہیں جن کو توفیق الٰہی کا بدرقہ حاصل ہو۔ اس میثاق کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے اس حقیقت کو ہر وقت مستحضر رکھنا ضروری ہے کہ یہ حق صرف چند رسوم ادا کر دینے سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ پوری صداقت اور پوری عزیمت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے ہر حکم کی تعمیل اس کی شرطِ اول ہے اگرچہ اس راہ میں جان و مال اور کنبہ و خاندان، ہر چیز کو قربان کر دینا پڑے۔ ہم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جن قوموں سے میثاق لیا جب انھوں نے محض شریعت کے چند رسوم ادا کر کے اس کے وفاداروں میں نام لکھوانے کی کوشش کی تو اس نے ان کو ٹھکرا دیا کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے نام نہاد مدعیانِ وفاداری کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ، دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا   خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے

وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ	کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ
الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ	کر لو، بلکہ وفاداری ان کی وفاداری
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ	پر، کتاب پر اور نبیوں پر صدق دل سے
وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي	ایمان لائیں اور اپنا مال اس کی محبت
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ	کے باوجود قرابت مندوں، یتیموں، مسکینو
وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ	مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے
فِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ	پر خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ	ادا کریں۔ جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ	عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔ خاص کر
وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ	وہ لوگ جو فقر و فاقہ، تکالیفِ جسمانی اور
وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ	جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ	والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○	راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو
(البقرۃ - ۲ : ۱۷۷)	سچے متقی ہیں۔

آیت کی تفسیر:

اس آیت نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی وفاداری کے تمام تقاضے پوری وضاحت سے بیان کر دیے ہیں۔ اس وجہ سے ہم اس کے بعض اہم اجزاء کی شرح کر کے ان کا مفہوم اچھی طرح واضح کر دینا چاہتے ہیں تاکہ اوپر ہم نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے ہر بات، قرآن کی روشنی میں مبرہن ہو جائے۔

اس آیت میں لفظ 'برّ' جو آیا ہے اس کا ترجمہ عام طور پر ہمارے مترجم نیکی کرتے ہیں۔ لیکن یہ اس لفظ کا ادھورا ترجمہ ہے، جس سے اس کا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ قرآن اور کلام عرب میں اس لفظ کے مواقع استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صحیح مفہوم 'وفاداری' ہے۔ ہم نے اپنی تفسیر —— تدبر قرآن —— میں اس کی تحقیق بیان کی ہے۔ اس مادے سے لفظ 'بَرٌّ' بھی ہے جس کے معنی وفا شعار اور فرماں بردار کے ہیں، مثلاً 'بَرٌّ بِوَالِدَيْهِ' اس بیٹے کو کہیں گے جو اپنے ماں باپ کا نہایت وفادار اور ان کے حقوق ادا کرنے والا ہو۔ اسی طرح 'بَرٌّ' اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جو عہد و پیمان اور جو وعدے کیے ہیں وہ سب ایک دن لازماً پورے کرنے والا ہے۔

اس روشنی میں 'لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ ..... الآیۃ' کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا حق صرف اتنے سے ادا نہیں ہو جاتا کہ رخ مشرق کی طرف کر لیا۔ یہ تو محض دین کے ظواہر ہیں۔ اصل وفاداری اور دین داری تو ان لوگوں کی ہے جو اللہ پر، روز جزا و سزا پر، فرشتوں پر، کتاب الٰہی پر سچا اور پکا ایمان لائیں اور ساتھ ہی قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کی آزادی کے لیے اپنے مال خرچ کریں۔

یہ بات، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ان یہود و نصاریٰ کو مخاطب کر کے فرمائی گئی ہے جن کے ہاں ایک خاص دور میں یہ بحث کہ قبلہ مشرق کی طرف ہے یا مغرب کی طرف، اس زور شور سے چھڑی ہوئی تھی کہ گویا تمام دین کا انحصار بس اسی چیز پر ہے درآنحالیکہ دین کی بنیادی باتوں یعنی ایمان کے تقاضوں اور اس کے عملی مطالبات کا کسی کو بھی احساس نہیں تھا۔ ان کو مخاطب کر کے تنبیہ فرمائی گئی کہ

نادانو، ان ظاہری رسم داریوں سے خدا کی وفاداری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ خدا کا حق ادا کرنے والے وہ لوگ بنیں گے جو ایمان کے حقیقی عقائدی اور عملی تقاضے پورے کرنے والے ثابت ہوں گے۔ یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے یہود کو فرمائی کہ "تم مچھر کو تو چھانتے ہو پر اونٹ کو نگل جاتے ہو، یا یہ کہ تم رکابی کو اوپر سے تو صاف کرتے ہو پر وہ اندر لوٹ کے مال سے بھری ہوئی ہے۔"

یہاں یہ بات نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ ایمان کے عملی تقاضوں میں سے سب سے پہلے انفاق کا ذکر آیا ہے حالانکہ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ ایمان کے بعد وہ بالعموم نماز کا ذکر کرتا ہے، لیکن یہاں نماز کا ذکر موخر ہوگیا ہے۔ پھر مزید قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "ایتائے مال" کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر الگ ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کے مال میں اللہ تعالیٰ کا حق صرف زکوٰۃ ہی نہیں، بلکہ اس کے علاوہ بھی ہے اور وفاداری کا مقام حاصل کرنے کے لیے اس کو ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ پہلو خاص اہمیت رکھنے والے ہیں اس وجہ سے ہم بالاختصار ان کی وضاحت کی کوشش کریں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہاں ایتائے مال کا ذکر اقامتِ صلوٰۃ پر مقدم ہے جو بظاہر قرآن کے معروف اسلوب کے خلاف ہے۔ لیکن اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ یہ کہ یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ مومن کو اللہ تعالیٰ کی کامل وفاداری کا مرتبہ و مقام کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ اس سوال کا واحد جواب، قرآن کی روشنی میں، یہی ہے کہ یہ مرتبہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں محبوب مال کے انفاق سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں ارشاد ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران ۳:۹۲)

(تم خدا کی وفاداری کا درجہ ہرگز نہیں حاصل کر سکتے جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو)۔ بالکل یہی بات یہاں "وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ"

کے الفاظ سے فرمائی ہے۔ یعنی وہ اپنے مال، ان کے محبوب ہونے کے باوجود، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ مال کے محبوب ہونے کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ مال بجائے خود اعلیٰ اور قیمتی ہو، دوسرا یہ کہ زمانہ ایسا ہو کہ اس میں وہ مال کمیاب ہو، مثلاً زمانہ قحط یا گرانی کا ہو۔ تیسرا یہ کہ آدمی کو خود اس مال کی احتیاج ہو، لیکن وہ اپنی ضرورت پر اللہ کے دوسرے بندوں کی ضرورت کو ترجیح دے: یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر - ۵۹: ۹) (وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں خود احتیاج ہو)۔ یہاں عَلٰی حُبِّهٖ کے الفاظ ان تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

رہا دوسرا سوال کہ کیا زکوٰۃ کے علاوہ مسلمان کے مال میں اللہ تعالیٰ کے کچھ اور حقوق بھی ہیں جن کا ادا کرنا مرتبۂ بِرّ و وفا حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ مسلمان کے مال میں سے وہ کم سے کم مطالبہ ہے جس کا پورا کرنا اسلامی حکومت کی گرفت سے بچنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ مطالبہ پورا کر دینے کے بعد حکومت اس سے کوئی تعرض نہیں کرے گی لیکن اللہ تعالیٰ کا مطالبہ بندوں سے صرف زکوٰۃ کا نہیں ہے بلکہ انفاق کا ہے جو سِرًّا بھی ہو اور علانیۃً بھی۔ اِقْرَاض کا مطلب یہ ہے کہ اگر ملت کو کوئی ناگہانی ضرورت یا حالتِ جنگ یا قحط یا کوئی آفت کے باعث کوئی ناگزیر حاجت پیش آجائے تو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں دل کھول کر خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ذمہ قرض کی حیثیت سے قبول فرمائے گا اور قیامت میں اس کو ایک عظیم خزانہ کی صورت میں واپس کرے گا بشرطیکہ یہ قرض، قرضِ حسن ہو۔ اس انفاق کی آخری حد مقرر فرما دی ہے کہ اس طرح کے حالات میں آدمی اپنے اور اپنے بیوی بچوں کی ناگزیر ضروریات سے جو کچھ بچا سکے سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دے۔ 'قُلِ الْعَفْوَ' میں 'عفو' کی تفسیر

ہمارے نزدیک یہی ہے۔ یہی انفاق ان لوگوں کے شایانِ شان ہے جو اللہ کے وفادار اور کامل العیار بندے بننا چاہتے ہیں اور قرآن مجید کے تدبر سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ یہی انفاق ہے جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ انفاق کرنے والے کو حکمت کا خزانہ بخشتا ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ "وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا" (البقرۃ - ۲ : ۲۶۹) (اور جسے حکمت ملی اسے خیرِ کثیر کا خزانہ ملا)۔

اس آیت میں "وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا" کے الفاظ بھی خاص طور پر غور کرنے کے ہیں۔ اوپر کی باتیں تو فعل کے صیغوں میں بیان فرمائیں، لیکن ایفائے عہد کو صفت کے صیغہ سے بیان کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا حق ٹھیک وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جن کے اندر ایفائے عہد کی خصلت صفتہً موجود ہو۔ وہ جب کبھی بھی کسی سے کوئی عہد کر بیٹھتے ہوں تو اس کے ایفا کو اپنی فتوّت کا لازمی تقاضا اور اپنی حمیّت کا ایک واجبی مطالبہ سمجھتے ہوں۔ اس حقیقت کا اظہار "اِذَا عٰهَدُوْا" کے الفاظ سے ہو رہا ہے یعنی جب وہ کوئی عہد کر بیٹھتے ہیں تو قولِ مرداں جان دارد کے مصداق اس کے لیے جان لڑا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے عام وعدوں کے معاملہ میں جن کا کردار یہ ہوگا وہ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کے معاملہ میں کبھی کسی کمزوری کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔

"وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ"

اس ٹکڑے کا عطف ہے تو "وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ" ہی پر لیکن صفتِ صبر پر خاص طور پر زور دینے کے لیے اس کو حالتِ نصب میں کر دیا ہے جس سے اس کے معنی میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا حق ادا کرنے والے خاص

بلکہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو فقر و فاقہ، جسمانی تکلیف اور جنگ کے مصائب کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنے والے ہوں گے۔

یہی بات اس باب کی آخری بات ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وفاداری بشرط استواری مطلوب ہے، جس کے بغیر ایمان، ایمان نہیں، بلکہ صریح نفاق ہے تو اس کے لیے سب سے بڑی شرط صبر یعنی عزیمت و استقامت ہی ٹھہرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کو مخاطب کر کے سرزنش کی ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ تم ایمان کا دعویٰ کر کے اپنے کو اہلِ ایمان میں شمار کرا لو گے اور تمہارے جھوٹے اور سچے میں امتیاز کے لیے اللہ تعالیٰ تمہیں کسی امتحان میں نہیں ڈالے گا؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر مدعی کے لیے جگہ نہیں ہے۔ اس کے ہاں شرفِ باریابی صرف انہی کو حاصل ہوگا جو ہر قسم کے امتحانوں سے گزر کر یہ ثابت کر دیں گے کہ انہوں نے 'سمعنا و اطعنا' کا جو عہد کیا ہے اس میں وہ بالکل سچے اور پکے ہیں۔ فرمایا کہ 'أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا' یہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے ہاں راست باز ٹھہریں گے اور 'وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ' اور یہی لوگ ہیں جو اس کی نگاہوں میں حقیقی متقی ہیں۔

حمیّت، حمایت اور جہاد

ایمان کے لازمی تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی کے اندر اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے لیے حمیّت، حمایت اور جہاد کا جذبہ ہو۔ یہی چیز اس کے ایمان کی صداقت کی شہادت ہے۔ اگر کسی کے اندر یہ جوہر نہ ہو اور وہ ایمان کا مدّعی ہو تو اس کا دعویٰ معتبر نہیں ہے، بلکہ اغلب یہ ہے کہ ایسا شخص منافق ہے۔

اللہ تعالیٰ اگرچہ کسی کی حمیّت و حمایت اور اس کی تائید و نصرت کا محتاج نہیں ہے، وہ اپنی ذات میں مستغنی اور سب سے بے نیاز ہے، لیکن اس نے اپنے دین کے معاملے میں یہ سنّت ٹھہرائی ہے کہ بندوں کے دلوں میں وہ اس کو زبردستی نہیں اتارتا، بلکہ اس کے ردّ و قبول کو اس نے کلیتہً ان کے انتخاب و اختیار پر چھوڑا ہے، اگر وہ اپنی پسند سے اس کو اختیار کرنے اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے قربانیاں پیش کرتے ہیں تو ان کی اس قدر دانی کو قبول فرماتا اور ان کے دین کو دنیا اور آخرت، دونوں میں ان کے لیے مثمر بناتا ہے۔ اور اگر وہ اس کو رد کر دیتے ہیں یا اس کے مدّعی تو بن بیٹھتے ہیں، لیکن اس کا حق ادا کرنے کا حوصلہ نہیں کرتے تو وہ ان کے لیے سبب خیر نہیں بنتا، بلکہ دنیا اور آخرت دونوں میں موجب خسران و وبال بن جاتا ہے۔ اسی طرح کے لوگوں کے بارے میں قرآن نے وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (البقرۃ - ۲ : ۶۱) (اور وہ خدا کا غضب لے کر لوٹے)

کے الفاظ سے تعبیر فرمائی ہے، یعنی جس کے دروازے سے ان کو سب سے بڑی سرفرازی لے کر لوٹنا تھا، وہاں سے وہ سب سے بڑا غضب لے کر لوٹے۔

دین کے ساتھ تعلق کی یہ نوعیت متقاضی ہوئی کہ آدمی کے اندر اس کے لیے حمیّت اور حمایت کا جذبہ اور اس کی سربلندی و سرفرازی کا برابر زندہ رہنے والا ولولہ ہو۔ یہی حمیّت و حمایت اور یہی ولولہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت ہے جو اس کو باوجود ہر چیز سے بے نیاز ہونے کے بہت محبوب ہے اور وہ اپنے ان بندوں کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے جو اس متاعِ عزیز کا نذرانہ اس کے حضور میں سب سے بڑی مقدار میں پیش کرنے کا حوصلہ کرتے ہیں۔

حمیّت، حمایت اور جہاد، یہ تینوں چیزیں بتدریج ایک دوسری سے ظہور میں آتی ہیں اور ان کے اندر باہم دگر نہایت گہرا معنوی تعلق ہے، اس وجہ سے ہم ان تینوں پر اس باب میں یک جا بحث کریں گے۔

حمیّت

ہر وہ شخص جس کے اندر فتوّت، یعنی جس کی جوانی میں جوانمردی، ہوگی لازماً اس کے اندر حمیت بھی ہوگی۔ حمیت کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص ظلم اور مظلومی، جبر اور مجبوری، حق اور باطل کی کسی آویزش میں خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، بے تعلق، سرد مہر اور خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا، بلکہ وہ لازماً، اپنی استطاعت کے حد تک، مظلوم اور کمزور کا ساتھ دے گا اور جابر و ظالم کا ہاتھ پکڑے گا، اگرچہ اس میں خود اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ اگر کوئی شخص اس جذبہ سے عاری ہے تو وہ انسانیت سے عاری ہے۔ اس فتوّت و حمیت کی بہترین مثالیں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہیں۔ انہوں نے ایک مظلوم اسرائیلی کو ایک قبطی کے ہاتھوں پٹتے دیکھا تو اس کو ایک پرایا جھگڑا سمجھ کر وہاں سے گزر نہیں گئے" بلکہ مظلوم کی حمایت کے لیے فوراً سینہ سپر ہوگئے۔ پھر جب وہ ظالم بالکل غیرارادی طور پر ان کے گھونسے سے ڈھیر ہوگیا تو اس حادثہ پر ان کو نہایت افسوس ہوا، اور انہوں نے صدقِ دل سے توبہ کی اس لیے کہ ان کے پیشِ نظر صرف مظلوم کی حمایت تھی، ظالم کو قتل کر دینا نہیں تھا۔ حمیت اگر مجرد خاندانی اور نسلی عصبیت پر مبنی ہو تو وہ حق و باطل کے امتیاز سے عاری ہوتی ہے، لیکن جو حمیت، حق کے منبع سے ظہور میں آتی ہے وہ کسی ادنیٰ تجاوز کو بھی گوارا نہیں کرتی اگرچہ وہ بلاارادہ ہی واقع ہوگیا ہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کا افسوس ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے اس افسوس کو پسند کیا اور ان کی توبہ قبول فرمائی۔

اس طرح کا واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دوسرے روز بھی پیش آیا۔ وہ شہر میں نکلے تو دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو پہلے روز کے واقعہ کا سبب ہوا تھا، آج ایک دوسرے قبطی سے الجھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر بھی ان کی حمیت میں حرکت پیدا ہوئی، لیکن اب کے اس کا رخ اور

تھا۔ انہوں نے اندازہ فرمالیا کہ اگرچہ اسرائیلی ان کا بھائی ہے، لیکن وہ شرپسند اور دنگئی آدمی ہے۔ اس کو ڈانٹا اور آگے بڑھے کہ اس کو اس کے شر سے روکیں۔ اپنے بھائی کو اس کے غلط اقدام سے روکنا بھی درحقیقت اس کی مدد اور صحیح فتوّت کا تقاضا ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ "اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُومًا" (اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظلم کر رہا ہو یا مظلوم ہو)۔ کسی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! اگر مظلوم ہو تب تو اس کی مدد بجا ہے، لیکن اگر وہ ظلم کر رہا ہو تب اس کی مدد کس طرح کی جائے؟ ارشاد ہوا کہ اس کو اس ظلم سے روکو، یہی اس کی مدد ہے۔[1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر اسی دوسری شکل میں اپنے بھائی کی مدد کرنی چاہی، لیکن اسرائیلی نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ اس کو مجرم ٹھہراتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں تو اس کو ڈر ہوا کہ کہیں ان کا بے پناہ گھونسا آج اس پر نہ پڑ جائے۔ یہ خیال کر کے وہ چلایا: "معلوم ہوتا ہے کہ کل تم نے جس طرح ایک قبطی کو قتل کیا ہے اسی طرح آج مجھے ہلاک کر دینا چاہتے ہو!" ساتھ ہی کمینوں کی طرح یہ طعنہ بھی دے دیا کہ "تم بننا تو چاہتے ہو اصلاح کرنے والے، لیکن تمہاری یہ روش مفسدوں کی سی ہے۔" اسرائیلی کے اس کمینہ پن کے سبب قبطی کے قتل کا راز فاش ہوا اور فرعون کی حکومت حضرت موسیٰؑ کی جان کے درپے ہوگئی جس کے نتیجہ میں آپ کو گھر در چھوڑنا پڑا۔

بظاہر دیکھیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمیّت و فتوّت ان کو بڑی مہنگی پڑی، اس لیے کہ اس کے نتیجہ میں انہیں ہجرت پر مجبور ہونا پڑا، لیکن فتوّت کی راہ میں یہ قربانی ایک معمولی قربانی ہے۔ اللہ کے جن بندوں کو یہ توفیق ملتی ہے زندگی کی اصلی منزل درحقیقت

---

[1] جامع الترمذی: کتاب الفتن، باب ٦٨

انہی کو ملتی ہے اور اس کی راہ میں وہ سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔

اسی طرح کا امتحان حضرت موسیٰؑ کو مدین پہنچ کر پیش آیا۔ وہاں وہ مدین کے کنوے پر بیٹھ گئے۔ کچھ نہیں پتہ کہ اب کہاں جائیں اور کس سے منزل کا نشان معلوم کریں۔ ایسی صورت حال میں آدمی اپنی ہی فکر سے فارغ نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ دوسروں کے قضیے نمٹانے کی کوشش کرے، لیکن حضرت موسیٰؑ کی فتوت و مروت اس بے بسی میں بھی پوری طرح بیدار رہی۔ انھوں نے دیکھا کہ چرواہے اپنی اپنی بکریوں کو پانی کے ڈول بھر بھر کے پلا رہے ہیں اور دو لڑکیاں اپنے ریوڑ کو روکے کھڑی ہیں۔ ان کی اس بے بسی پر ان کو ترس آیا۔ پوچھا "بیبیو! تمہارا ماجرا کیا ہے؟ تم کیوں دور کھڑی ہو؟" وہ بولیں کہ "ہمارے باپ بوڑھے ہیں، بکریوں کی چرواہی ہمیں کرنی پڑ رہی ہے۔ ہمارے لیے چرواہوں کی اس بھیڑ میں گھسنا ممکن نہیں، مجبوراً ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا پڑتا ہے جب تک چرواہے فارغ ہو کر یہاں سے چلے نہ جائیں۔ جب وہ چلے جاتے ہیں تب ہماری باری آتی ہے۔" یہ سن کر حضرت موسیٰؑ اٹھے، ڈول ہاتھ میں لیا اور اپنے مضبوط بازوؤں سے پانی بھر بھر کے نکالا، ان کی بکریوں کو پلایا اور پھر جا کر اس درخت کے نیچے بیٹھ گئے جس کے نیچے سے اٹھے تھے۔ اس دوران میں ایک لفظ بھی ان کی زبان سے اپنی غربت و مسافرت کے بارے میں نہیں نکلا۔ بس یہ دعا زبان پر جاری ہوئی کہ "رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ" (القصص - ۲۸ : ۲۴) (اے میرے رب! جو خیر بھی اس وقت تو میرے لیے اتارے، میں اس کا حاجت مند ہوں)۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد یہ راز ان پر کھل گیا کہ جہاں ان کو جانا تھا وہ منزل آ گئی۔ ان کی جس حمیت و فتوت نے ان کو گھر سے نکالا اسی نے ان کو منزل کا سراغ دیا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا یہ شان کون دکھا سکتا ہے! جو لوگ اپنے اندر اس روح ملکوتی کو بیدار رکھتے ہیں وہ اسی طرح متحانات سے دوچار ہوتے اور پھر اسی طرح ان سے سرخرو ہو کر نکلتے ہیں، لیکن اس بھید سے ناآشنا

بہت تھوڑے لوگ ہیں۔

اسی روح کو بیدار رکھنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ:

من رای منکم منکراً، فاستطاع ان یغیرہٗ بیدہٖ فلیغیرہٗ بیدہٖ، فان لم یستطع، فبلسانہٖ۔ فان لم یستطع، فبقلبہٖ وذالک اضعف الایمان[1]۔

اگر تم میں سے کوئی شخص شریعت اور فطرت کے معروف کے خلاف کوئی بات دیکھے اور وہ اس کی اصلاح کا اختیار رکھتا ہو تو چاہیے کہ وہ اس کی اصلاح کردے اور اگر اختیار نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کو روکے اور اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو وہ دل سے اسے ناگوار جانے یعنی اس سے اپنے آپ کو دور رکھے، اور یہ ایمان کا ادنیٰ ترین مقام ہے۔

اس حدیث کے آخری الفاظ خاص طور پر نگاہ میں رکھیے جو شاہد ہیں کہ جو شخص کسی منکر کے معاملہ میں اتنی حمیت وغیرت بھی اپنے اندر نہیں رکھتا کہ کم از کم دل ہی میں اس سے بیزار اور اپنی ذات کی حد تک اس سے مجتنب رہے تو وہ ایمان سے عاری ہے۔

اس حمیت ہی کو زندہ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ جس سوسائٹی کو وہ دیکھیں کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی باتوں اور اس کے حکموں کی عملاً یا قولاً بے حرمتی کی جاتی ہے اس سے دور رہیں:

اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَ یُسْتَھْزَاُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ۔ (النسآء ۔ ۴ : ۱۴۰)

جب تم سنو کہ آیاتِ الٰہی کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو۔

---

[1] سنن ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

ایسے لوگوں کے اندر عزت و شرف کا طلب گار بن کر جانا تو درکنار اگر آدمی بھول کر بھی چلا جائے تو چاہیے کہ یاد آتے ہی وہاں سے دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی باتوں کا مذاق اڑانے والے اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہدایت ہے:

فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى	تو یاد آنے کے بعد ان لوگوں کے
مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝	ساتھ نہ بیٹھو!

(الانعام - ٦ : ٦٨)

اس آیت سے دو باتیں بالکل واضح طور پر نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ ایسے لوگوں کے اندر آدمی ان کا ساتھی اور ہم مشرب بن کر نہیں جا سکتا۔ اگر جا سکتا ہے تو یا تو مقصدِ اصلاح سے جا سکتا ہے یا بھول کر۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی شخص ان کا ساتھی بن کر ان کے ساتھ بیٹھتا ہے تو وہ انہی میں سے ایک ہے اور اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوگا۔

ایک روایت میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ جا کر کسی بستی کو الٹ دیں۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ باری تعالیٰ، اس میں تیرا فلاں نیک بندہ بھی ہے۔ حکم ہوا کہ اس کے سمیت بستی کو الٹ دو، اس لیے کہ اس کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی پر تمتمایا نہیں۔ حدیث ملاحظہ ہو:

عن جابر، قال: قال رسول الله	حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ
صلى الله عليه وسلم: اوحى	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے
الله عز وجل الى جبريل	جبریل علیہ السلام کو حکم بھیجا کہ فلاں بستی کو
عليه السلام ان اقلب مدينة	اس کے باشندوں سمیت الٹ دو۔ جبریلؑ
كذا وكذا باهلها۔ فقال:	نے عرض کیا کہ اے رب! اس میں تو
يارب! ان فيهم عبدك	تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے کبھی ایک

فلانًا لم يعصك طرفة عين. قال: فقال: اقلبها عليه وعليهم فان وجهه لم يتغير فی ساعة قط۔

لمحے کے لیے بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ حکم ہوا کہ اس پر اور تمام دوسروں پر اس کو الٹ دو کیونکہ اس شخص کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی کے لیے بھی تمتمایا نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ان لوگوں کی رسمی فرض داری کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جن کے اندر دین کے لیے غیرت و حمیت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ غیور ہے، وہ غیرت سے خالی لوگوں کے رسمی تحفوں کو قبول نہیں کرتا۔

حمایت

حمیّت کا لازمی تقاضا ہے کہ اس سے حق کی حمایت و نصرت ظہور میں آئے۔ یہی چیز اس کے وجود کی شہادت ہے اور یہی، جیسا کہ اوپر ہم نے عرض کیا، اس کے پرکھنے کے لیے کسوٹی بھی ہے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کے ضعف و قوّت کا کیا حال ہے اور کس حد تک اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اس کا علم اس وجہ سے ضروری ہے کہ کسی اچھے معاشرے کے اندر کسی فرد کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس کے اس جوہرِ حمیّت ہی سے ہوتا ہے، دوسری چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس مال ہو، خاندان کی وجاہت بھی ہو، صحت، قوت اور علم بھی ہو، لیکن اس کے اندر حمیّت و قوت نہ ہو تو یہ ساری چیزیں رکھنے کے باوجود اس کا وجود معاشرے کے لیے بالکل بے قیمت ہے۔ اس کے برعکس ایک دوسرا شخص، اگرچہ ان چیزوں میں سے کوئی شے بھی اپنے پاس نہ رکھتا ہو، لیکن اس کے خون میں قوّت کی حرارت ہو تو وہ پوری ملت کے لیے ایک دولت گرانمایہ ہے۔ وہ تیغ کے بغیر لڑنے والا

سپاہی ہے جو اپنی قوم کے لیے ایک لشکر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس وصف کی اس خاص اہمیت کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی صداقت کے لیے معیار یہ ٹھہرایا ہے کہ وہ حق کی حمایت و نصرت کے لیے مال اور جان کی قربانیاں پیش کریں۔ اسی امتحان پر ان کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے۔ جو شخص اس امتحان میں کامیاب ہوا وہ مومن ہے، جو ناکام ہوا وہ منافق۔

قرآن میں یہ حقیقت یوں واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی حق کی حفاظت کے لیے کسی دوسرے کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ہر ظلم و تعدّی کا انتقام خود لے سکتا اور ہر حق کو خود اپنے بل پر قائم کر سکتا اور برابر قائم رکھ سکتا ہے، لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ لوگوں کو آزادی دے کر یہ امتحان کرے کہ کون اس کی مخالفت کے لیے اٹھتا ہے اور کون اس کی حمایت و نصرت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتا ہے۔ اس سنتِ الٰہی کا بیان سورۂ محمد میں یوں ہوا ہے:

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاْ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ط (محمد - ۴۷ : ۴)	اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے انتقام لے لیتا، لیکن اس نے تم کو یہ حکم اس لیے دیا کہ ایک کو دوسرے سے آزمائے۔

مطلب یہ ہے کہ کفّار اور مشرکین کے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو جو دعوت دی گئی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد کے لیے ان کا محتاج ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ دشمنوں کے بڑے سے بڑے لشکر کو خود چشم زدن میں اس طرح مٹا سکتا ہے کہ روئے زمین پر ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے، لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ ان کے مخلص اور منافق پرکھے جائیں اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی تائید و نصرت سے نوازے۔

یہی امتحان ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کریں اور یہ وعدہ فرمایا ہے کہ جو لوگ اس کی مدد کریں گے اللہ تعالیٰ

ان کی مدد فرمائے گا:

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ	اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے
اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○	گا جو اس کی مدد کے لیے اٹھیں گے بے شک
(الحج - ۲۲ : ۴۰)	اللہ نہایت قوی اور غالب ہے۔

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر لوگوں کو اپنی مدد کی دعوت دیتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ کسی کی مدد کا محتاج ہے۔ بلکہ یہ چاہتا ہے کہ اس پردے میں وہ اپنے ان بندوں کی مدد کرے جو اس کے دین کی نصرت کے لیے اٹھیں۔

اللہ تعالیٰ کی مدد کا سب سے بڑا مظہر اس کے رسول کی مدد ہے۔ اس لیے کہ اس کے نمائندے کی حیثیت سے وہی لوگوں کے سامنے آتا ہے۔ اس کی مدد ہی درحقیقت اللہ کی مدد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ	پھر آئے گا تمہارے پاس ایک رسول،
لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ	مصداق بن کر ان پیشین گوئیوں کا جو تمہارے
وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ	پاس موجود ہیں تو اس پر ایمان لانا اور اس
(آل عمران - ۳ : ۸۱)	کی مدد کرنا۔

اس رسول کی تائید و نصرت کی صورت اور اس کے صلہ کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ	تو جو اس پر ایمان لائے جنہوں نے اس کی
عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا	عزت کی، اس کی مدد کی اور اس روشنی کی
النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ	پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○	تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

(الاعراف - ۷ : ۱۵۷)

دوسرے درجہ میں اس مدد کے حق دار خود مسلمان آپس میں ایک دوسرے کی طرف سے ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان چونکہ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے اخوت کا رشتہ ہے اس وجہ سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی جو مدد کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی مدد کرتا ہے اور اس پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلہ کا حق دار ہے۔ چنانچہ کوئی مسلمان اگر دین کے معاملہ میں اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے مدد کا طلب گار ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ تاحدِ امکان اس کی مدد کرے۔ اگر قدرت رکھتے ہوئے وہ اس میں کوتاہی کرے گا تو وہ اس پر دنیا میں بھی ملامت کا سزاوار ٹھہرے گا اور آخرت میں بھی اس کے لیے جواب دہ ہوگا۔ دین میں اس کی اہمیت اس درجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جو مسلمان کفار کے نرغے میں تھے ان کے متعلق یہ ہدایت فرمائی گئی کہ وہ ہجرت کر کے ایسے مقامات پر چلے جائیں جہاں ان کو توقع ہو کہ وہ اپنے دین کی حفاظت کر سکیں گے اور ساتھ ہی دوسرے مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ وہ اپنے ان بھائیوں کی اس طرح مدد کریں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں، اور اگر کسی مجبوری کے سبب سے وہ ہجرت نہ کر سکیں تو اس صورت میں بھی، جہاں تک ان کے دین کی حفاظت کا تعلق ہے، وہ مسلمانوں کی مدد کے حق دار ہوں گے۔ اسی طرح کے مسلمانوں کے بارے میں فرمایا ہے:

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ۔	اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے طالبِ مدد ہوں تو تم پر مدد واجب ہے۔

(الانفال - ۸ : ۷۲)

اس فرض کی اہمیت اسلام میں اس درجہ ہے کہ بعض شرعی مجبوریوں کے سوا، جن کی قرآن میں وضاحت کر دی گئی ہے، اور کوئی چیز اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔

جہاد

یہی مقام ہے جہاں سے یہ حمایت و نصرت جہاد فی سبیل اللہ کی شکل اختیار کرتی ہے یعنی حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے نیک بندے اس امر کا اہتمام کریں کہ وہ باہمی تعاون سے ایسی قوت فراہم کریں کہ دین کی راہ میں پیش آنے والی مزاحمتوں کا وہ موثر مقابلہ کرسکیں۔ انفرادی قوتوں سے صرف انفرادی مزاحمتوں ہی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مزاحمت اگر جماعتی ہو تو اس سے مقابلہ کے لیے لازماً ضرورت ہوگی کہ جماعتی قوت فراہم کی جائے۔ دنیا عالمِ اسباب ہے، ہرچند حق کے اندر بجائے خود بڑی طاقت مضمر ہوتی ہے، لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ ہر طرح کی مسرعاتت رکھنے کے باوجود اپنے دین کی نصرت کا کام اپنے بندوں سے لیتا ہے اسی طرح حق کی طاقت بھی اسباب کے پردے ہی سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ سنتِ ابتلاء کا لازمی تقاضا ہے جو اس کائنات میں جاری ہے اور جس کی طرف ہم نے تمہید میں اشارہ کیا ہے۔

اسی جہادی قوت کو فراہم کرنے کے لیے سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو دعوت دی۔ یہ دعوت اگرچہ تمام نبیوں نے دی ہے، لیکن ہم نے حضرت مسیح علیہ السلام کا حوالہ خاص طور پر دو وجہوں سے دیا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ آپ کے متعلق یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ آپ صرف پند و موعظت کے پیغمبر تھے، اپنے ساتھیوں کے اندر آپ نے اس طرح کا کوئی ولولہ نہیں ابھارا جس کا تعلق کسی نوعیت سے جنگ و جہاد سے ہو۔ دوسرے اس وجہ سے کہ قرآن نے آپ کی اس دعوت اور آپ کے ساتھیوں کے اس رویّہ کو جو انہوں نے اس دعوت کے جواب میں اختیار کیا مسلمانوں کے سامنے بطور ایک اعلیٰ مثال کے پیش کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ صف میں فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا	اے ایمان والو! تم اللہ کے انصار ہو، جیسا
اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ	کہ عیسٰی ابنِ مریم نے دعوت دی حواریوں
مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ	کو: کون میرا مددگار بنتا ہے، اللہ کی راہ میں؟
اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ	حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے انصار
اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ	بنتے ہیں تو بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ
مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ	ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا تو ہم
طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ	نے ایمان والوں کی، ان کے دشمنوں کے
اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ	مقابلے میں مدد کی تو وہ غالب رہے۔

(الصف - ٦١ : ١٤)

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی اس دعوت کا ذکر سورۂ آلِ عمران میں بھی ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلے تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی معروف سنّت کے مطابق اپنی قوم کے سادات واکابر اور علماء و فقہاء کو دعوت دی، لیکن جب آپ کو یہ اندازہ ہوگیا کہ دین داری کے یہ پشتینی ٹھیکہ دار پسیجنے والے نہیں ہیں تو آپ نے ان کو چھوڑ کر اپنے غریب ساتھیوں اور دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کو دعوت دی کہ میرے پیچھے چلے آؤ تو میں تم کو آدم گیر بناؤں گا[1]۔ ان غریب مچھیروں نے آپ کی دعوت قبول فرمائی اور انھی کو اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کے فروغ اور اس کے غلبہ کا ذریعہ بنا دیا۔ آیت میں اس صورتِ حال کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ	پس جب عیسٰی نے ان کی طرف سے کفر
الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ	کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ

---

[1] انجیل متی۔ باب ۴ : ۱۹

اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (آل عمران - ۳ ، ۵۲)	کون میرا مددگار بنتا ہے، اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیے کہ ہم مسلم ہیں۔

یہاں وہ حقیقت پیش نظر رہے جس کی طرف ہم نے تمہید میں اشارہ کیا ہے کہ انسان کے اندر اصل روح، حمیتِ حق ہے جس پر کسی کا اجارہ نہیں ہے۔ یہ اللہ کے فضل سے اس کے ان بندوں کو نصیب ہوتی ہے جو اپنی فطرت کو مسخ ہونے سے بچائے رکھتے ہیں، عام اس سے کہ وہ امیر ہیں یا غریب، اعیان واکابر میں سے ہیں یا غرباء وعوام میں سے، عالی نسب قریشی ہیں یا حبشی غلام۔ سیدنا مسیح علیہ السلام انسانی فطرت کے اس رمز سے اچھی طرح واقف تھے، اس وجہ سے جب آپ نے وقت کے اکابر کو ٹٹول کر دیکھ لیا کہ ان کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے تو آپ نے عوام کے اندر منادی کی اور اللہ نے انہی کے اندر سے ایسے ساتھی آپ کو دے دیے جو تمام خلق کے داعی اور معلم بنے اور جو اگرچہ آئے تو تھے دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کے اندر سے لیکن ان کی دعوت نے بڑے بڑے تاج داروں کو مسخر کر لیا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں کے بعد اس حمیتِ حق اور نصرت وجہاد کی سب سے زیادہ شاندار مثال مدینہ کے انصار نے پیش کی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ابتدائی دور میں انصار کے جو قافلے مکہ حج کے لیے آتے وہ یہ معلوم کر کے نہایت متاثر ہوتے کہ یہاں ایک شخص لوگوں کو نیکی اور خدا پرستی کی دعوت دے رہا ہے، لیکن لوگ اس کی باتوں پر کان دھرنے کی بجائے اس کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ اس صورتِ حال نے ان کی حمیتِ حق کو بیدار کیا اور ان میں سے بعض غیور اس مظلومِ حق کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اللہ کے ان بندوں کے ذریعہ

سے یہ دعوت مدینہ پہنچ گئی اور وہاں کی سرزمین اس کے لیے اتنی سازگار ثابت ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے وہاں جڑ پکڑ لی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ صورت پیدا ہو گئی کہ مکہ کے مظلوم مسلمان اس سرزمین کو اپنے لیے ایک مامن خیال کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس نے ان کے لیے ایک دارالہجرت کی حیثیت اختیار کر لی۔ پہلے کمزور مسلمانوں نے اس کا رخ کیا، اس کے بعد وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہجرت فرمائی جس کے بعد قدرتی طور پر مدینہ اسلام اور دعوتِ اسلامی کا مرکز بن گیا۔

انصار نے جس جوش و خروش اور جس دریا دلی سے اپنے مہاجر بھائیوں کا خیر مقدم کیا، جس فیاضی سے اپنے گھروں، اپنے باغوں اور اپنی جائدادوں اور ملکیتوں میں ان کو شریک بنایا اور جس عقیدت و احترام سے اللہ کے رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو اپنے سروں اور دلوں پر بٹھایا اس کے متعلق کم سے کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے اس کی کوئی اور نظیر نہیں ہے۔ یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ انصار و مہاجرین کی اخوت کی حیثیت صرف اخلاقی اخوت کی نہیں تھی بلکہ ایک عرصہ تک اس کو قانونی حیثیت بھی حاصل رہی اور جب اس کی یہ حیثیت منسوخ ہوئی تو یہ انصار کے کسی مطالبہ پر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسلامی شریعت کے مزاج کے تقاضوں کے تحت منسوخ ہوئی اس لیے کہ مہاجرین کے مسائل اس طرح حل ہو گئے تھے کہ اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

یہ حقیقتِ نفس الامری یہاں ملحوظ رہے کہ انصار نے مہاجرین کو پناہ دینے کا کام بظاہر نہ تو معاشی نقطۂ نظر سے اپنے لیے مفید کیا تھا، نہ سیاسی نقطۂ نظر سے۔ معاشی پہلو سے تو اس کی غلطی یوں واضح تھی کہ انہوں نے اپنی رفاہیت میں ایک ایسے جمِ غفیر کو ساجھی بنا لیا جس کو قریش نے ان کے گھروں سے بالکل خالی ہاتھ نکالا تھا۔ سیاسی اعتبار سے اس میں یہ غلطی تھی کہ مدینہ کو اسلامی دعوت کا مرکز بنا کر انہوں نے اس کی پُرسکون زندگی کو تمام عرب و عجم کی دشمنی کا ہدف بنا دیا۔ اس گمان کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے کہ انصار اپنے اس اقدام کے نتائج کا کوئی

اندازہ نہیں رکھتے تھے۔ ان دونوں باتوں سے وہ اچھی طرح واقف نہ تھے۔ پیش آنے والے سیاسی خطرات سے تو خود قریش نے ان کو آگاہ کر دیا تھا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کو جب یہ اندازہ ہوا کہ انصار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنے پاس لے جانا چاہتے ہیں تو انہوں نے نہایت کھلے لفظوں میں ان کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے یہ اقدام کرنے کی جسارت کی تو تمام اسود و احمر سے جنگ کے لیے تیار رہیں۔ لیکن انصار نے ان کی ان دھمکیوں کی خس برابر بھی پروانہ کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد مدینہ پر حملوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا لیکن انصار ان حملوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئے۔ انہوں نے آپ کو جس حمایت و نصرت کا اطمینان دلایا تھا اس پر پوری پامردی سے قائم رہے۔ بعض جنگوں کے مواقع پر جب ان کو گمان ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ اندازہ فرمانا چاہتے ہیں کہ ان آئے دن کے حملوں سے متعلق انصار کے تاثرات کیا ہیں، وہ کس حد تک ان کو برداشت کر سکتے ہیں تو انصار کے لیڈروں نے آپ کو ایسے الفاظ میں اطمینان دلایا جو تاریخ میں تا ابد یادر کھے جائیں گے۔ ایک موقع پر انصار کے لیڈر نے کہا کہ حضور، ہم بنی اسرائیل کی طرح کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر دشمنوں سے لڑیں، ہم گھر میں بیٹھیں گے۔ خدا کی قسم! اگر آپ یہ حکم دیں گے کہ ہم اپنے گھوڑے سمندروں میں ڈال دیں تو ہم اس حکم کی بھی بے چون و چرا تعمیل کریں گے!

انسان کا تعلّق اپنی ذات سے

پچھلے ابواب میں ہم نے 'بندے اور رب کے تعلّق' کے مقتضیات بیان کیے ہیں اگر وہ ذہن میں مستحضر ہیں تو یہ سمجھنا آپ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے کہ اپنی ذات کے ساتھ آپ کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؛ اس کی روشنی میں آپ خود، بے تکلف، اس حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں کہ آپ خالق نہیں، بلکہ مخلوق ہیں؛ خدا نہیں، بلکہ بندے ہیں. تو لازماً آپ اپنی ذات کے معاملے میں خود مختار اور مطلق العنان بھی نہیں ہو سکتے، بلکہ اخلاقاً اور عقلاً آپ پابند ہیں آپ کا ہر اقدام اس خالق و پروردگار کی پسند کے مطابق ہو جس نے آپ کو وجود بخشا ہے اور جو آپ کی پرورش کر رہا ہے۔

یہ شعور یہ رہنمائی دیتا ہے کہ آپ اپنی ذات اور اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اپنے رب کی امانت تصور کریں اور اسی حیثیت سے ان کے ساتھ معاملہ کریں۔ آپ ان میں سے کسی چیز کو اپنے ارادہ سے ضائع اور برباد کر سکتے، اور نہ رہن اور بیع کر سکتے، اور نہ امانت رکھنے والے کی مرضی کے خلاف ان میں کوئی تصرف کر سکتے۔

خالق نے آپ کے اندر جو قوتیں اور صلاحیتیں بھی ودلیعت کی ہیں وہ سب بلا استثناء آپ کے مقصدِ وجود کے لیے لازمی اور ضروری ہیں، کوئی چیز بھی ایسی

نہیں جو کاٹ پھینکنے کے لائق ہو۔ ان میں سے کوئی چیز کسی برائی کا سبب بنتی ہے تو
آپ کے سوءِ استعمال سے بنتی ہے خرابی شے میں نہیں، بلکہ آپ کے طریقِ استعمال میں
ہوتی ہے۔ آپ اگر اپنی قوتوں کو صحیح طریقہ پر، صحیح محل میں، استعمال کریں گے تو ان سے
اپنی اور اپنی پوری نوع کی خدمت کریں گے اور غلط طریقہ، غلط محل میں، استعمال کریں گے
تو ان سے اپنی دنیا اور آخرت، دونوں برباد کریں گے۔ جوگیوں اور راہبوں کو یہ غلط فہمی
ہوئی کہ انہوں نے جسم اور جسمانی قوتوں کو بجائے خود روح کی ترقی میں مزاحم تصور کیا اور
اس تصور کے تحت اپنے جوگیانہ اور راہبانہ نظام میں ان کو ختم کرنے کے لیے جاں گسل
ریاضتیں ایجاد کیں جن کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ حالانکہ اس طرح انہوں نے
روح کی ترقی و اصلاح کے مقصد کو کوئی فائدہ پہنچانے کے بجائے الٹا اس کو نہایت شدید
نقصان پہنچایا۔ روحِ انسانی جس طرح آسمان سے غذا حاصل کرتی ہے اسی طرح زمین
سے بھی غذا حاصل کرتی ہے۔ جسم کی قوتیں اگر صحیح طور پر نشو و نما پائیں اور اپنے صحیح محل
میں استعمال ہوں تو ان سے روح قوت حاصل کرتی ہے۔ برعکس اس کے اگر جسم بیمار
ہو تو بیمار جسم کی روح بھی مضمحل ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیے جوگیوں
اور راہبوں نے انسان کی جنسی خواہش کو نہایت مہلک ٹھہرایا ہے اور روح کی آزادی
اور اس کی تطہیر کے لیے اس کے قلع قمع کو لازمی بتایا ہے حالانکہ جس شخص کے اندر قوتِ
مردانگی نہ ہو اس کے اندر فتوت، بسالت اور شجاعت کا پایا جانا بھی ممکن نہیں ہے
درآنحالیکہ یہ صفتیں ایک زندہ اور بیدار روح کا اصلی جمال ہیں۔ اگر کسی شخص میں یہ
چیزیں نہ ہوں تو وہ نیم مردہ انسان ہے جس کے اندر بعض منفی قسم کی صوفیانہ نیکیاں
تو پرورش پا سکتی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ محراب و منبر کی زینت بننے کے لیے بھی
بعض اوصاف اپنے اندر پیدا کر لے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کر سکے
جس کے لیے فتوت کا جوہر مطلوب ہوتا ہے۔

یہ تنبیہ ہم نے اس لیے یہاں ضروری سمجھی ہے کہ اسی راہبانہ تصوّر کے تحت ہمارے اربابِ تصوّف نے بھی روح کی تطہیر کے لیے بعض ایسے اعمال و اشغال ایجاد کیے ہیں جن کی شریعت میں اگرچہ کوئی اصل نہیں ہے، لیکن وہ ان کے زیادہ سے زیادہ اہتمام پر بہت زور دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کاموں میں جو مشقت اٹھائی جاتی ہے روح کے لیے اصلی برکت اسی کے اندر ہے۔ کھانے پینے اور لذات کی تقلیل، بلکہ ان کے ترک کے لیے وہ نہایت جاں گسل ریاضتیں کرتے ہیں اور ان کا زعم یہ ہے کہ اس سے ان کے اندر باطن کا جو نور پیدا ہوتا ہے وہ مخفی حقائق سے پردے اٹھا دیتا ہے۔

اس طرح کی کوئی چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں ہمیں نہیں ملتی، حالانکہ روحانی پاکیزگی کے اعتبار سے ان کا جو مرتبہ ہے وہ کسی دوسرے کا نہ ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس ان کے ہاں ہر معاملہ میں اعتدال و میانہ روی کی تعلیم ملتی ہے اور اگر کسی کے کسی عمل سے اس کے اندر کسی غالیانہ رجحان کا اظہار ہوا ہے تو اس کی حوصلہ شکنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہے اور حضراتِ صحابہؓ نے بھی۔ اگر کسی نے دین کے معاملہ میں تشدد کی راہ اختیار کرنی چاہی تو حضورؐ نے اس کو متنبہ فرمایا کہ 'جو دین سے دھینگا مشتی کرنی چاہے گا تو وہ شکست کھا جائے گا'

بعض لوگوں نے زندگی کی بعض لذتوں کو دین داری کے خلاف سمجھ کر ترک کر دینے کا اظہار کیا تو حضورؐ نے ان کو تنبیہ فرمائی کہ میں تم سب سے زیادہ علم رکھنے والا اور اپنے رب سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں تو جب میں یہ سارے کام کرتا ہوں تو تم ان سے کیوں احتراز کرو؟ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ:

صنع النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام کیا اور
شیئًا ترخص فیہ وتنزہ	بعد میں اس میں رخصت دے دی تو

بعض لوگ اس رخصت سے فائدہ اٹھانے سے احتراز کرنے لگے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی، پھر فرمایا: بعض لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ان کاموں کو کرنے سے احتراز کرتے ہیں جن کو میں خود کرتا ہوں۔ خدا کی قسم! میں ان سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں اور ان سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں۔	عنه قوم۔ فبلغ ذالك النبي صلى الله عليه وسلم۔ فحمد الله، ثم قال: ما بال اقوام يتنزّهون عن الشيء اصنعه۔ فوالله! اني اعلمهم بالله واشدهم له خشية[1]۔

ایک دوسری حدیث سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہوتی ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ تم اپنے تئیں تشدد کی راہ مت اختیار کرو کہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے باب میں تشدد کی پالیسی اختیار کرنے لگے۔ ایک قوم نے اپنے اوپر سختی کی روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے لیے سختی ہی کو روا رکھا۔ انہی کی یادگاریں کلیساؤں اور گرجوں میں دیکھ رہے ہو۔	ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول: لا تشددوا على انفسكم فيشدد عليكم۔ فان قوما شددوا على انفسهم فشدد الله عليهم فتلك بقاياهم في الصوامع والديار[2]۔

جن لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال بسا ہوا تھا کہ نفس کو زیادہ سے زیادہ مشقت میں

---

[1] صحیح البخاری: کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب ۵

[2] سنن ابی داؤد: کتاب الادب، باب فی الحسد

ڈالنا روحانی ترقی کے لیے ضروری ہے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ تمہارے نفس کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔ اسی ذیل میں نفس کے بعض متعلقات کے نام لے کر آپؐ نے اس تعلیم کی اچھی طرح وضاحت بھی فرما دی کہ لوگوں کو اس کے سمجھنے میں کوئی اشتباہ نہ رہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ:

کیا ہے اور اس اعتدال کی تربیت کے لیے انسان کو کیا راہ اختیار کرنی چاہیے تو ان میں سے کسی سوال کے جواب کے باب میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو تاریکی میں نہیں چھوڑا

قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یا عبد اللہ! الم أخبر انك تصوم النهار وتقوم الليل؟ فقلت: بلی، یا رسول اللہ! قال: فلا تفعل، صم وافطر وقم ونم۔ فان لجسدك علیك حقاً، وان لزوجك علیك حقاً، وان لزورك علیك حقاً۔[1]

مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم دن کو روزے رکھتے ہو اور رات بھر نمازیں پڑھا کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ صحیح ہے، یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: ایسا نہ کرو۔ کبھی روزہ رکھو، کبھی افطار کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔ کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جورو کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔

ان تعلیموں سے اسلام کا صحیح مزاج سامنے آتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوتوں اور نعمتوں میں سے کسی چیز کو روحانی ترقی کے لیے ختم کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ پورے اعتدال کے ساتھ، اس کے صحیح مصرف میں استعمال کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ رہی یہ بات کہ کسی چیز کا صحیح مصرف کیا ہے اور اس کے باب میں صحیح نقطۂ اعتدال

---

[1] صحیح البخاری: کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم

ہے، بلکہ قوتوں کے صحیح محلِ استعمال کی بھی وضاحت کی ہے اور وہ طریقے بھی تعلیم کیے ہیں جن پر عمل کر کے انسان اپنے رہوارِ نفس کو لگام لگا سکتا ہے اور اس کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھ سکتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو لوگ اپنی دین داری کی نمائش کرنی چاہتے ہیں وہ صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتے جو اللہ اور رسول نے بتایا ہے، بلکہ وہ یہ کرتے ہیں کہ جو چیز دین میں سیر بھر مطلوب ہے اس کو من بھر بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو ان کی طرف توجہ ہو کہ اصلی دین دار یہ ہیں اس لیے کہ ان کا گول دوسروں سے آگے ہے حالانکہ ان کی یہ نمائش عارضی ہوتی ہے۔ بہت جلد وہ وقت آجاتا ہے جب وہ دین کی اصل چیز کو تو چھوڑ بیٹھتے ہیں اور اپنی ایجاد کی ہوئی بدعت کو اس کی جگہ اصل قرار دے لیتے ہیں۔ اس طرح سنت تو مٹ جاتی ہے اور اس کی جگہ بدعت رہ جاتی ہے۔ شاید نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ اس طرح کے الفاظ فرمائے ہیں کہ جو بدعت بھی وجود میں آتی ہے وہ ایک سنت کو مٹا کر وجود میں آتی ہے۔

نفس کے حقوق

نفس کے بارے میں یہ غلط فہمیاں غور کیجیے تو خاصی سنگین ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اربابِ تصوف نے بھی اس باب میں تقریباً وہی نقطۂ نظر اختیار کر لیا ہے جو عیسائی متکلمین اور ان کے راہبوں کا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ اس میں ہندو جوگیوں کے تصورات کی بھی آمیزش ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہم قرآن اور حدیث کی روشنی میں بتائیں کہ نفس کے ہم پر کیا حقوق ہیں اور وہ کس طرح ادا کیے جا سکتے ہیں۔

پہلا حق ـــــ معرفتِ نفس:

ہمارے اوپر نفس کا پہلا حق یہ ہے کہ ہم اس کی صحیح صحیح معرفت حاصل کریں۔ انسان ایک عالمِ اصغر ہے اور اس کے نفس کے چھوٹے سے آئینہ میں وہ سب کچھ منعکس کر دیا گیا ہے جس کا جاننا اس کی زندگی کی رہنمائی کے لیے ضروری ہے۔ حکماء میں سے جو واقعی حکیم ہیں، انہوں نے اس حقیقت کا سراغ دیا ہے۔ سقراط، جو تمام حکماء کا امام ہے، کا یہ قول مشہور ہے کہ "اے انسان! تو اپنے آپ کو پہچان" افلاطون نے اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ کہا ہے کہ "روحِ انسانی کو اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے تمام حقائق سے آگاہ کر دیا گیا ہے، لیکن اس پر ذہول طاری ہو گیا ہے۔ تذکیر اور تذکّر سے اس کی یاد دہانی ہوتی رہتی ہے" ارسطو کی رائے یہ ہے کہ "انسان کے نفس کے اندر جو خزانہ ہے اگر وہ اس کو برآمد کر لے تو اس کے لیے کافی ہے" بعد کے ادوار میں بھی تمام قابلِ ذکر حکماء نے اس حقیقت کا اظہار و اعتراف کیا ہے۔

قرآن میں بھی یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اس دنیا میں بھیجے جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم کی ارواح سے اپنی توحید اور ربوبیت کا اقرار لیا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ	اور یاد کرو، جب نکالا تمہارے رب
اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ	نے بنی آدم سے ـــــ ان کی پیٹھوں
ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي	سے ـــــ ان کی ذریت کو اور ان کو
اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ	گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا: کیا
قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ	میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے "ہاں
(الاعراف - ۷ : ۱۷۲)	تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔

قرآن میں یہ بات بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کی تشکیل

اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی کے تمام مبادی الہام کر دیے ہیں تاکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو جائے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا	شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو
فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا	سنوارا۔ پس اس کو سمجھ دی اس
وَتَقْوٰىهَا	کی بدی اور نیکی کی۔

(الشمس - ۹۱ : ۷ - ۸)

قرآن میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ	بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، اگرچہ
وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ	کتنے ہی بہانے پیش کرے۔

(القیٰمۃ - ۷۵ : ۱۴ - ۱۵)

یہ تمام باتیں دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے دُہرا انتظام فرمایا ہے۔ سب سے پہلے اس کی فطرت کو اپنی ہدایت سے نوازا۔ اس کے بعد اپنی وحی سے بھی اس کو مشرف کیا تاکہ اندر اور باہر، دونوں طرف سے اس کو نور حاصل ہو اور وہ چاہے تو "نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ" بن جائے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ باہر کے نور کی بھی حقیقی قدر انھی کے اندر پیدا ہوتی ہے جن کا اندر کا نور زندہ ہوتا ہے۔ وہ ان کے لیے دلیل اور رہنما کا کام کرتا ہے۔ جو اپنے اندر کے نور کو بجھا دیتے ہیں وہ باہر کے نور سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس وجہ سے انسان کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کے مخفی خزانوں سے اچھی طرح واقف ہو، ان کا برابر جائزہ لیتا رہے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ اپنے اندر کی آواز انسان کے لیے سب سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ اس کو وہ جس طرح سنتا اور سمجھتا ہے اور پھر اس پر اس کو

جس درجہ اذعان ہوتا ہے اس درجہ اذعان خارج کی آواز پر مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ یہ آواز اپنی صداقت کے لیے کسی دلیل کی محتاج نہیں ہوتی، بلکہ خود آپ اپنی دلیل ہوتی ہے۔

دوسرا حق —— تربیتِ نفس:

نفس کا دوسرا حق یہ ہے کہ انسان اس کی تربیت کرے۔ تربیت سے مراد یہ ہے کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو روشنی ودیعت فرمائی ہے کوشش کرے کہ وہ بجھنے نہ پائے، بلکہ اس میں برابر افزونی ہوتی رہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس سے کبھی تغافل نہ برتے، بلکہ اس کی ہر آواز کو سنے اور اس پر لبیک کہے۔ انسان کا ضمیر کبھی رہنمائی کرنے میں کبھی غفلت نہیں برتتا۔ لیکن انسان بعض اوقات اپنی خواہشوں کے دباؤ کے تحت، اس کی تعمیل سے کترانے کے لیے کچھ مصلحتیں اور بہلنے پیدا کر لیتا ہے۔ اگر وہ اس طرح کی بہانہ بازی کا خوگر ہو جائے تو پھر ضمیر کی قوت کمزور ہو جاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ بالکل مضمحل، بلکہ بے جان ہو جاتا ہے۔ یہ حالت ظاہر ہے کہ ضمیر کی موت کے ہم معنی ہے اور اگر ضمیر مردہ ہو جائے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اب فطرت کی ترجمانی کرنے والا کوئی نہیں رہا اور انسان اپنے باطن کی روشنی سے بالکل محروم ہو گیا۔

اس فتنہ سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے ضمیر کی مخالفت سے اپنے امکان کے حد تک اپنے کو بچائے اور اگر اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے اس لیے کہ ضمیر کی موت ایسی چیز نہیں ہے جو کسی حالت میں بھی گوارا کی جاسکے۔ جس آدمی کا ضمیر مردہ ہو چکا ہو اس کی زندگی زمین کے لیے لعنت ہے۔ جس شخص سے اس طرح کا گناہ صادر ہو وہ اگر پھر روحانی زندگی حاصل کرنا چاہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ خالق اور خلق، دونوں کے سامنے

اپنے جرم کا اعتراف کرے اور اپنے ضمیر اور اپنے رب سے بتصمیم قلب اقرار کرے کہ آئندہ وہ اس جرم کا ارتکاب نہ کرے گا۔

تربیتِ نفس کے اس جہاد میں اس نصب العین کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی کمال بہ ترقی کا بتایا ہے۔ کمال درجۂ ترقی کے باب میں ہمارا نقطۂ نظر صوفیوں کے نقطۂ نظر سے بہت مختلف ہے۔ صوفی حضرات تو اپنے وحدت الوجود کے فلسفہ کے تحت نفسِ انسانی کے لیے کمال درجۂ ترقی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا میں ضم ہو جائے۔ ع

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

لیکن ہمارے نزدیک یہ محض شاعری اور خیال آرائی ہے۔ قرآن کی روشنی میں نفس کی سب سے بڑی ترقی یہ ہے کہ اس کی ایسی تربیت ہو جائے کہ وہ نفسِ مطمئنہ بن جائے تاکہ آخرت میں اس کو 'راضیۃً مرضیۃً' کا اعلیٰ ترین مرتبہ حاصل ہو جائے

يَآيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (الفجر - ۸۹ : ۲۷ - ۲۸)

اے وہ جس کا دل (اپنے رب پر) جما رہا! چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔

'نفسِ مطمئنہ' سے مراد یہ ہے کہ دل اس طرح خدا اور اس کی باتوں پر ٹھک جائے کہ سخت سے سخت حالات میں بھی وہ ڈانوا ڈول اور اپنے نصب العین سے منحرف نہ ہو۔ 'راضیۃً مرضیۃً' سے مقصود یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مقام حاصل کرے کہ پکار اٹھے کہ جو کچھ اس نے اپنے رب سے امیدیں باندھیں وہ اس کے گمانوں اور امیدوں سے کہیں زیادہ پوری ہوئیں اور اس کا رب بھی اس کو بندگی کے معیار پر پورا پائے۔ بس یہی مقام سب سے اونچا مقام ہے۔ جو یہ حاصل کرلے اس کے لیے 'فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۙ وَادْخُلِيْ

جَنَّتِیْ (الفجر - ۸۹: ۲۹-۳۰) (مل جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری بہشت میں) کی بشارت ہے، اگرچہ اس نے کبھی کوئی بشارت انگیز خواب دیکھا ہو اور نہ کبھی اس پر کوئی غیب منکشف ہوا ہو۔ اور جو اس سے محروم رہا وہ اللہ تعالیٰ سے محروم ہے اگرچہ وہ پانی پر چلتا اور ہوا میں اڑتا ہو۔

تربیتِ نفس کے لیے نصب العین کی حیثیت تو اسی چیز کو حاصل ہے، لیکن یہ عمر بھر کے لیے ایک کٹھن جہاد ہے اس وجہ سے اس میں ہر قدم پر رہنمائی اور بدرقہ کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت قرآن مجید کے تدبر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی سے پوری ہوگی؛ بشرطیکہ آدمی آزاد ذہن کے ساتھ مطالعہ کرے، تقلید و تقید سے آزاد ہو اور اس بات پر ایمان رکھتا ہو کہ صحیح اور کامل علم کی دولت صرف حضراتِ انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوئی۔

تیسرا حق ـــــ عزتِ نفس:

نفس کا تیسرا حق یہ ہے کہ آدمی اس کی عزت کرے۔ 'عزت' سے مراد یہ نہیں کہ آدمی اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے کہ ہم چو من دیگرے نیست۔ یہ عزتِ نفس نہیں بلکہ کبرِ نفس ہے۔ جو اس میں مبتلا ہوا وہ شیطان کے سب سے بڑے فتنہ میں مبتلا ہوا اور اس کی ہلاکت یقینی ہے۔

'عزتِ نفس' سے ہماری مراد یہ ہے کہ انسان اس امرِ واقعی کو ہمیشہ یاد رکھے کہ اس کے رب نے اس کو اپنی خلافت سے نوازا ہے، اس کو اس عظیم امانت کا امین بنایا ہے جس کو آسمان اور زمین نہ اٹھا سکے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ	اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی

فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا	تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے
وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا	انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان
الْاِنْسَانُ ؕ	نے اس کو اٹھا لیا۔

(الاحزاب - ۳۳ : ۷۲)

اس کے رب نے اس کے اندر وہ قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائیں جو اپنی تمام مخلوقات میں سے کسی کو بھی نہیں بخشیں۔ دنیا کی ہر چیز اس کے لیے مسخر کی گئی، لیکن وہ کسی کے لیے نہیں مسخر کیا گیا؛ بلکہ اس کے رب نے اس کو صرف اپنی بندگی کے لیے خاص کیا ہے۔ اس سرفرازی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی ایسی بات کا مرتکب نہ ہو جو اس کے اس تمام شرف کو خاک میں ملا دے۔

انسان کا جتنا بڑا مرتبہ ہے اتنی ہی بڑی ذلت بھی اس کے لیے ہے، اگر وہ اس مرتبہ کی قدر نہ کرے۔ چنانچہ قرآن میں مختلف اسلوبوں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی عزت کی قدر نہیں کرتا تو پھر وہ 'اسفل سافلین' کے کھڈ میں پھینک دیا جاتا ہے، جس سے کبھی اس کو نکلنا نصیب نہیں ہوتا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ	ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا
اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ؗ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ	پھر ہم نے اس کو ادنیٰ درجہ میں ڈال
اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ	دیا جب کہ وہ خود گرنے والا بنا۔

(التین - ۹۵ : ۴-۵)

سورۂ اعراف میں یہود کی تاریخ بیان کرتے ہوئے واضح فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قوموں کی امامت بخشی، لیکن انہوں نے اس کی قدر نہیں کی تو ان کو تنبیہ فرمائی گئی کہ وہ متنبہ ہوں، لیکن جب انہوں نے اس سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل کر دیا اور وہ کتوں کے مانند ہو کے رہ گئے جن کا حال

یہ ہوتا ہے کہ ان کو اگر ماریے تو بھی زبان نکالے رکھتے ہیں اور اگر چھوڑ دیجیے جب بھی زبان نکالے رکھتے ہیں:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِیٓ	اور ان کو اس کی سرگزشت سناؤ جس کو
اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا	ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان
فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ	سے نکل بھاگا، پس شیطان اس کے پیچھے
مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا	لگ گیا، بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا اور
لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ	اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ
اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ	سے سربلند کرتے، لیکن وہ زمین ہی کی طرف
فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ	جھکا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بنا رہا۔ تو
تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ	اس کی تمثیل کتے کی ہے، اگر تم اس کو دھتکارو
يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ	جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یا چھوڑ دو جب
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ	بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ یہ تمثیل ہے اس
(الاعراف - ۷: ۱۷۵ - ۱۷۶)	قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔

اس عزتِ نفس کے تحفظ کے لیے چند حقیقتوں کا شعور ہر لمحہ انسان میں تازہ رہنا چاہیے ورنہ شیطان اس کو کسی ایسے فتنہ میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل ہونے کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ ذلت کے حوالے کر دے تو اس کو کوئی بھی عزت دینے والا نہیں بن سکتا۔ اس حقیقت کو قرآن نے یوں واضح فرمایا ہے کہ:

وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ	اور جس کو خدا ذلیل کر دے تو ان کو کوئی
مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ	دوسرا عزت دینے والا نہیں بن سکتا۔
(الحج - ۲۲: ۱۸)	

اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ انسان اس نکتہ کو ہمیشہ یاد رکھے کہ جو شخص خود اپنی عزت نہیں کرتا اس کی دوسرے بھی عزت نہیں کرتے۔ ایک حکیم شاعر کا قول ہے کہ:

من لا یکرم نفسہ لا یکرم

(جو خود اپنی عزت نہیں کرتا اس کی دوسرے بھی عزت نہیں کرتے)

مطلب یہ ہے کہ جب آپ خود اپنی پیشانی کی، اپنی نگاہ کی، اپنی زبان کی اور اپنی عقل و ذہانت کی قدر نہیں کرتے، بلکہ ان کو خریدنی و فروختنی شے سمجھ کر ہر اس شخص کے ہاتھ بیچتے ہیں جو آپ کو کچھ پیسے دے، قطع نظر اس سے کہ اس کا معیار کیا ہے اور جس مقصد کے لیے وہ خرید رہا ہے اس مقصد کے لیے ان کا استعمال ان کے خالق نے جائز بھی رکھا ہے یا نہیں تو پھر آپ کو یہ شکایت نہیں ہونی چاہیے کہ دوسرے آپ کے گھر کو پشیز کے برابر سمجھتے ہیں اس لیے کہ خود آپ کی نگاہوں میں ان کی اس سے زیادہ قدر نہیں ہے جب آپ کی پیشانی ہر دروازے کے سجدہ سے آلودہ ہے، آپ کی نگاہ ہر تاک جھانک کے لیے آزاد ہے، آپ کی زبان ہر اہل و نااہل کی قصیدہ خوانی کر سکتی ہے، سوال صرف قیمت کا ہے تو پھر معاف کیجیے کہ جس طرح ایک بازاری عورت کسی احترام کی حق دار نہیں سمجھی جاتی آپ بھی کسی عزت و احترام کے حق دار نہیں ہیں۔

چوتھا حق ــــــ احتسابِ نفس:

نفس کا چوتھا حق یہ ہے کہ اس کا برابر محاسبہ کرتے رہیے کہ اس نے کیا نیکی کمائی ہے اور کیا برائی کمائی ہے کیونکہ اس چیز پر آپ کی نجات یا ہلاکت کا انحصار ہے۔ مرنے کے بعد آپ کے عمل کے سوا اور کوئی چیز کام آنے والی نہیں ہے۔ یہی پکڑوائے گا اور یہی چھڑائے گا۔ اس کے ذرہ ذرہ کا حساب ہونا ہے اس وجہ سے ضروری ہے

کہ اس حساب سے پہلے آپ خود اپنا حساب کر رکھیں۔ اس سے متعلق حضرت عمرؓ کا ایک نہایت حکیمانہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا۔ و تزینوا للعرض الاکبر۔ وانما یخف الحساب یوم القیامۃ علی من حاسب نفسہ فی الدنیا۔[1]	اپنے نفسوں کا محاسبہ کر لو قبل اس کے کہ تمہارا حساب ہو، اور بڑے میدان کے واسطے تیار ہو جاؤ اور بے شک قیامت کے دن کا حساب اسی پر آسان ہوگا جو دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے گا۔

قرآن میں یہ ہدایت موجود ہے کہ:

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (الحشر - ۵۹ : ۱۸)	اور چاہیے کہ ہر نفس اچھی طرح جائزہ لے رکھے اُس کا جو اُس نے کل کے لیے کیا ہے۔

یہ جائزہ برابر لیتے رہنا چاہیے۔ یہ کام ہر روز سونے سے پہلے بھی آپ کر سکتے ہیں۔ لیکن موزوں ترین وقت اس کا فجر سے پہلے یعنی تہجد کا ہے، بشرطیکہ اس کی توفیق حاصل ہو۔ قرآن کے اشارات سے اس مقصد کے لیے اس وقت کی موزونیت واضح ہے۔ اس وقت رحمتِ آسمانی مغفرت کرنے والوں کی تلاش میں ہوتی ہے۔ کیا عجب کہ کسی خوش قسمت کی قسمت لڑ جائے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

اپنا محاسبہ کرنے میں رواداری اور ڈھیل سے کام نہ لیجیے اور نہ اپنے کو الاؤنس دینے کی کوشش کیجیے، بلکہ ایک ایک چیز پر نگاہ ڈالیے اور ہر کوتاہی اور حق تلفی کی تلافی کی کوشش کیجیے اللہ تعالیٰ کے حقوق کے معاملہ میں تو توبہ و استغفار سے گناہ دھل جاتے ہیں، لیکن بندوں کے حقوق کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ اس میں ضروری ہے کہ تا بحدِ امکان اس ظلم کی تلافی کی جائے جو صادر ہوا ہے اور بندے کو بھی راضی کیا جائے اور ساتھ ہی اپنے رب سے بھی اس تعدی کی معافی مانگی جائے جس کا ارتکاب ہوا ہے۔

---

[1] سنن الترمذی: کتاب صفۃ القیامۃ، باب ۲۵

باب ۱۳

آدمی کا تعلّق کنبہ، خاندان معاشرہ اور ریاست سے

علمائے عمرانیات نے انسانی فطرت کا یہ ایک نہایت اہم راز منکشف کیا ہے کہ وہ ایک اجتماعیت پسند حیوان (SOCIAL ANIMAL) ہے۔ اس کی مثال انگور کی بیل کی ہے جو پروان چڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے ایک سہارے کی محتاج ہوتی ہے۔ یہ سہارا اس کو حاصل ہو تب تو وہ پھلتی پھولتی ہے ورنہ سکڑ کے رہ جاتی ہے اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ انسان بھی، اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق، پروان چڑھنے کے لیے سہارے کا محتاج ہے۔ یہ سہارا اس کو خاندان اور معاشرے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ چیز اگر اس کو حاصل ہو جائے تب تو اس کی تمام مخفی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ اگر کسی سبب سے یہ حاصل نہ ہو سکیں تو یہ سب دب کر ختم ہو جاتی ہیں۔

یہ تمثیل ہمارے نزدیک بالکل صحیح ہے۔ بس اتنا فرق دونوں میں ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انگور کی بیل کو جو سہارا مطلوب ہے وہ اس کو چمن کا مالی مہیا کرتا ہے اور انسان کو جو سہارا مطلوب ہے وہ ابتدائے خلقت ہی سے خود اسی کے اندر مضمر ہے۔ وہ جب دنیا میں آیا ہے تو یکہ و تنہا نہیں آیا ہے، بلکہ اپنا سارا باغ و چمن اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔ اس نے اس زمین پر جہاں بھی ڈیرا ڈالا تھوڑی ہی مدت میں اپنی بزم اس طرح آراستہ کر لی کہ اس کی ذہنی اور مادی صلاحیتوں کو اپنا عمل کرنے کے لیے جن محرکات اور سہاروں کی ضرورت

تھی وہ سب اس کو حاصل ہو گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے انسان ——— حضرت آدمؑ ——— جب اس دنیا میں تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تنہا نہیں بھیجا، بلکہ ان کی رفاقت کے لیے انہی کی جنس سے ان کا جوڑا پیدا کیا۔ اس جوڑے سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پیدا ہوئیں۔ پھر انہوں نے بالتدریج خاندانوں اور قبیلوں کی صورت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ ان کی باہمی پیوستگی سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جس کے اندر انسان کے اجتماعی اور سیاسی شعور کی تربیت کے لیے وہ سب کچھ فراہم ہو گیا جو مطلوب تھا۔ قرآن مجید نے اپنے مختصر اور جامع الفاظ میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ	اے لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو جس
الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ	نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی
نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا	کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں
زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا	سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔
كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ج وَاتَّقُوا	اور ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے
اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ	سے تم باہم گر طالب مدد ہوتے ہو
بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	اور ڈرو قطع رحم سے۔ بے شک
عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ○	اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔

(النسآء - ۴ : ۱)

اس آیت پر تدبر کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس کے اندر ان تمام اساسات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے جن پر اس کائنات کے فاطر نے انسانی اجتماعیت کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر ان کو اجاگر کر دیا جائے اور ان پر زندگی کی تعمیر کی جائے تو خاندان، معاشرہ اور ریاست ہر چیز کی اٹھان اس نقشہ پر ہو گی جو اس دنیا کے خالق کا بنایا ہوا نقشہ ہے اور جس کو

بروئے کار لانے ہی کے لیے اس نے انسان کو اس زمین کی خلافت بخشی ہے۔

یہ بنیادی اصول مندرجہ ذیل ہیں:

ایک یہ کہ یہ دنیا کوئی بے راعی کا گلہ نہیں ہے، بلکہ اس کو اس خدا نے وجود بخشا ہے جو سب کا پروردگار ہے۔ اس وجہ سے کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس میں دھاندلی مچائے اور من مانی کرنے کی جسارت کرے، بلکہ سب کو اس خداوند کی پکڑ سے ڈرتے رہنا چاہیے جو سب کا خالق و مالک ہے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو ایک ہی نفس ——— حضرت آدمؑ ——— سے وجود بخشا ہے اس وجہ سے نسب کے اعتبار سے سب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ عربی اور عجمی، کالے اور گورے، سب برابر ہیں۔ ان میں کسی کو کسی پر ترجیح ہوگی تو اکتسابی صفات کی بنا پر ہوگی۔ اس کے سوا شرف کے دوسرے معیارات سب باطل ہیں۔

تیسرا یہ کہ جس طرح سب انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اسی طرح سب کی ماں بھی اصلاً ایک ہی ——— حضرت حوا ——— ہیں۔ اس اعتبار سے بھی کسی کو کسی پر کوئی ترجیح اور فوقیت حاصل نہیں ہے۔ ایک ہی ماں باپ سے یہ پورا گھرانا وجود میں آیا ہے۔ حضرت حوا، آیت سے واضح ہے کہ حضرت آدمؑ ہی کی جنس سے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ عورت مرد کے مقابل میں کوئی حقیر اور فروتر مخلوق نہیں ہے، بلکہ وہ بھی اس شرف میں برابر کی شریک ہے جو انسان کو بحیثیت انسان حاصل ہے۔

چوتھا یہ کہ انسانی معاشرہ میں تعاضد و تناصر کی بنیاد وحدتِ الٰہ، وحدتِ آدم اور اشتراکِ رحم کے عقیدے اور جذبے پر ہے۔ ہر ایک پر واجب ہے کہ وہ اس اشتراک کا حق پہچانے اور اس کو ادا کرے اور ساتھ ہی اس امر کا اہتمام رکھے کہ کوئی ایسا نعرہ لوگوں پر غالب نہ ہونے پائے جو اس فطری اشتراکیت کی بنیاد کو منہدم کر دینے والا اور اس کی جگہ کسی

جاہلی جذبہ کو ابھارنے والا ہو۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز ابھرتی نظر آئے تو یہ پورے معاشرے کے لیے ایک شدید خطرے کا الارم ہے اور معاشرے کے ہر درد مند کا فرض ہے کہ وہ اس کو روکنے کے لیے اپنا زور صرف کرے۔ آیت کے آخر میں ' وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ' (اور ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے سے تم باہم دگر طالب مدد ہوتے ہو اور ڈرو قطع رحم سے) کے الفاظ سے اسی خطرے سے متنبہ کیا ہے۔ اس لیے کہ حقیقت میں یہی ستون ہیں جن پر اسلام نے خاندان، معاشرہ اور ریاست کی عمارت تعمیر کی ہے۔ جب تک یہ ستون قائم ہیں یہ عمارت قائم رہے گی، جب یہ کمزور ہو جائیں گے عمارت خطرے میں پڑ جائے گی اور جب یہ گر جائیں گے عمارت بھی پیوند زمین ہو جائے گی۔

ان اصولوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آئیے دیکھیے کہ انسان کو اپنے خاندان و کنبہ، اپنی قوم اور معاشرہ اور اپنی ریاست کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہر گام پر کس طرح ان کی نگرانی کرنی پڑتی ہے اور اگر وہ ذرا غافل ہو جائے تو کس طرح وہ کشتی ہی خطرے میں پڑ جاتی ہے جس پر وہ اپنے پورے خاندان، بلکہ اپنی پوری قوم سمیت، سوار ہوتا ہے۔

آدمی کا تعلّق کنبہ اور خاندان سے

کنبہ اور خاندان میں آدمی کا سب سے زیادہ قریبی تعلق اوپر کی جانب اپنے ماں باپ اور نیچے کی جانب اپنے بیوی بچوں سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے سب سے پہلے انہی کے اندر دیکھنا چاہیے کہ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے یا کیا ہونی چاہیے۔ اس کی روشنی میں دوسروں کے ساتھ اس کے تعلقات کے سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔ سب سے پہلے ماں باپ کے ساتھ اس کے تعلّق کو سمجھیے۔

ماں باپ کے ساتھ آدمی کا تعلّق:

آدمی کو پیدا تو اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، لیکن اس کے پیدا کرنے کا ذریعہ اس کے ماں باپ کو بنایا ہے۔ وہی اس کی زندگی کے ابتدائی دور میں، جب اس کی حیثیت ایک مضغۂ گوشت سے زیادہ نہیں ہوتی، اس کی غور و پرداخت، رضاعت و پرورش اور دیکھ بھال کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور وہ اس خدمت کو، کسی ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کے بغیر، ایسے دلی جوش و جذبہ کے ساتھ انجام دیتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی ذات کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ گویا ان کی زندگی کا سارا لطف و عیش اس ننھے سے وجود کی خدمت کے اندر سمٹ آیا ہے جو ان کی گود میں ڈال دیا گیا ہے۔ ان کی اس فدویت و قربانی کا کم سے کم صلہ

ان کی اولاد کی طرف سے، جب کہ وہ جوانی کو پہنچے اور وہ پیری اور ناتوانی کے دور میں داخل ہو رہے ہوں، یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی نگاہوں میں جو درجہ ان کا ہو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کا بھی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا درجہ سب سے بلند و بالا ہونا تو ایک امر بدیہی ہے اس لیے کہ حقیقی خالق، پروردگار اور محسن وہی ہے، دوسروں کی حیثیت، خواہ ان کے ذریعہ سے کتنا ہی بڑا احسان ظہور میں آیا ہو، وسائل و ذرائع کی ہے اور وسائل و ذرائع جس کو بھی حاصل ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے عقل و فطرت کی رو سے سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ ہی کا ہوا، دوسروں کا حق بہرحال اس کے حق کے تحت ہی ہوگا۔

قرآن نے اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۝ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۝ (لقمٰن - ۳۱ : ۱۴ - ۱۵)	اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا کہ میرے شکر گزار رہو اور اپنے والدین کے۔ میری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، تو ان کی بات نہ مانیو اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک رکھیو۔

ان آیات میں پہلی چیز جو والدین کے عظیم مرتبہ کی شہادت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شکر گزاری کے حق کو اپنی شکر گزاری کے ہم پلہ کی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے جس

سے وہ بات صاف طور پر نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ آدمی پر
اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑا حق اس کے والدین ہی کا ہے، اور کسی کا بھی نہیں۔ آیت
کے فحویٰ سے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے پیدا کرنے اور اس کے پروان چڑھانے
میں جو حصہ والدین کا ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کسی دوسرے کا ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ اگرچہ اولاد کی شکرگزاری کے حق دار ماں اور باپ، دونوں
ہیں، لیکن ماں کا حق اولاد کے اوپر باپ کی نسبت کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ بات یوں واضح
ہوئی کہ اگرچہ شکرگزاری کے حق دار کی حیثیت سے ماں اور باپ دونوں کا ذکر ہوا ہے، لیکن
تین نمایاں خدمات ——— حمل اٹھائے پھرنے کی سختیاں جھیلنا، وضع کے وقت جان
کی بازی کھیلنا اور پھر پورے دو سال تک اپنے خون کو دودھ بنا کر رضاعت کی خدمت
انجام دینا ——— صرف ماں ہی کی بیان ہوئی ہیں، باپ کی کسی خدمت کا ذکر نہیں
ہوا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگرچہ خدمت کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ اس سے یہ بات
نکلتی ہے کہ اگرچہ خدمت اور شکرگزاری کے حق دار ماں اور باپ، دونوں ہی ہیں، لیکن ماں کا
حق باپ کے مقابل میں تین گنا ہے۔ آیت سے یہ بات اشارۃً نکلتی ہے۔ نبی صلی اللہ
علیہ وسلم نے اس اشارہ کو ایک شخص کے سوال کے جواب میں واضح فرما دیا۔ سائل نے سوال
کیا کہ میرے حسنِ خدمت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں!
یہی سوال اس نے دوسری مرتبہ اور تیسری مرتبہ دہرایا تو ہر بار آپ نے یہی جواب دیا۔
پھر جب اس نے چوتھی مرتبہ دہرایا تو اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ تمہارا باپ! نبی
صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب اس آیت کی بہترین تفسیر ہے۔ حدیث ملاحظہ ہو:

عربی	ترجمہ
عن ابی ھریرۃ۔ قال: جاء	حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص
رجل الیٰ رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر
علیہ وسلم فقال: من	ہوا اور سوال کیا کہ میرے حسنِ خدمت کا
احق الناس بحسن صحابتی؟	سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ نے

فقال : امك . قال، ثم من؟ فرمایا: تیری ماں۔ اس نے پوچھا پھر کون؟
قال : ثم امك - قال : ثم من؟ آپ نے فرمایا : تیری ماں۔ اس نے پھر پوچھا،
قال : ثم امك - قال : ثم من؟ پھر کون؟ آپ نے فرمایا : تیری ماں۔ اس نے
قال : ثم ابوك[1] پھر پوچھا، پھر کون؟ آپ نے فرمایا : تیرا باپ۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ اولاد پر ماں باپ کے حقوق کسی دنیوی اختلاف تو درکنار ایمان اور عقیدہ کے اختلاف کی صورت میں بھی باقی رہیں گے۔ ان کو یہ حق تو نہیں ہوگا کہ وہ اولاد کو اللہ تعالیٰ کے ایمان اور اس کے دین سے روکنے کے لیے زور لگائیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو اولاد ان کی اطاعت سے انکار کر دے گی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا حق ان کے حق سے بڑا ہے۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود، جہاں تک دنیوی زندگی کے حالات و معاملات ہیں ان میں، ان کے احترام، ان کی خدمت اور ان کی محبت و فرماں برداری کی ذمہ داریاں بدستور اولاد پر باقی رہیں گی۔ بیماری میں ان کی عیادت و تیمار داری، ضرورت میں ان کی تا بہ حد استطاعت مدد، کسی مصیبت میں ان کی حمایت و مدافعت، کسی بار کے اتارنے میں ان کے ساتھ فراخ دلانہ تعاون؛ یہاں تک کہ ان کے تند و تلخ رویہ کے باوجود ان کی ہدایت و مغفرت کے لیے دل سوزی کے ساتھ دعا و استغفار سے اولاد کے لیے بے پروا ہونا کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ آپ کے باپ کا رویہ کتنا ظالمانہ اور سنگ دلانہ تھا، لیکن عین اس وقت جب کہ اس نے آپ کو ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال دیا آپ نے اس سے کہا تو صرف یہ کہا کہ 'سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا' (مریم - ۱۹ : ۴۷) (میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت مانگوں گا، وہ میرے حال پر بڑا ہی مہربان ہے) اور آپ نے اس کی تمام تعدیوں کے باوجود، اپنے اس وعدے کے مطابق، اس وقت تک برابر اس کے لیے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب ۱

استغفار کا سلسلہ جاری رکھا جب تک اللہ تعالیٰ نے اس سے آپ کو روک نہیں دیا۔
یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک خاص
حد پر اس استغفار سے روک دیا، لیکن قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے لیے
ان کی اس دردمندی کو اس نے پسند فرمایا اور اس کو ان کے 'اوّاہ' اور 'حلیم' یعنی دردمند
اور بردبار ہونے کا نتیجہ قرار دیا اور خاص اہتمام سے اُن کی اِن صفات کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ
ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ	اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت مانگنا
لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ	صرف اس وعدے کے سبب سے تھا جو
وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا	اس نے اس سے کر لیا تھا۔ پھر جب اس
تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ	پر واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس
لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ	سے اعلان برأت کر دیا۔ بے شک ابراہیم
اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ؀	بڑا ہی رقیق القلب اور بردبار تھا۔

(التوبۃ - ۹ : ۱۱۴)

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ اپنے والدین کی خدمت کا موقع نہیں ملا لیکن
رضاعی ماں، حضرت حلیمہؓ کے ساتھ آپ کا جو سلوک رہا وہ شاہد ہے کہ جب رضاعی ماں
کے لیے آپ کے جذبات یہ تھے تو حقیقی ماں کے لیے کیا کچھ ہوتے اگر ان کے ظہور میں
آنے کی نوبت آتی! روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حلیمہؓ جب کبھی دیہات سے
مدینہ تشریف لاتیں تو آپ ان کو دیکھ کر فرطِ محبت سے، میری ماں! میری ماں!! کہتے
ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ پھر جب وہ رخصت ہونے لگتیں تو آپ ان کو تحفوں اور ہدیوں
کے ساتھ نہایت محبت و اکرام کے ساتھ رخصت فرماتے۔

والدین سے متعلق اولاد کے فرائض :

ان اصولی باتوں کے علاوہ قرآن مجید نے والدین سے متعلق اولاد کے فرائض کی مزید تفصیل بھی بیان کی ہے ۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا ہے :

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ	اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے
اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ	سوا کسی اور کی بندگی نہ کر اور ماں باپ
اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ	کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کر ۔ اگر وہ
اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا	تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان
تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا	میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اُف
وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا	کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ	کہو اور ان کے لیے رحم ولانہ اطاعت کے
الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ	بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ اے
وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا	میرے رب ! ان پر رحم فرما، جیسا کہ
رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۭ	انہوں نے بچپن میں مجھے پالا ۔

(بنی اسرائیل - ۱۷ : ۲۳ - ۲۴)

ان آیات سے بھی پہلی بات تو وہی سامنے آئی جو اوپر گزری کہ آدمی پر سب سے بڑا حق اس کے رب کا ہے جو یہ ہے کہ وہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرے ۔

دوسری بات جو سیاق و سباق سے نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی بندگی کے سوا کسی اور کی بندگی کا روادار ہوتا تو وہ اولاد کو حکم دیتا کہ وہ اپنے والدین کی عبادت کرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا، لیکن اس نے ان کی عبادت کا حکم نہیں دیا، صرف ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایت

زمانی ہے۔ تو جب وہ عبادت میں حصہ دار نہ بن سکے جن کو اللہ نے اس کے وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا تو تابہ دیگراں چہ رسد!

تیسری یہ کہ والدین کے معاملہ میں اولاد کے لیے امتحان کا اصلی مرحلہ اس وقت آتا ہے جب ان میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی بڑھاپے کو پہنچتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ حق دار تو ہوتے ہیں، لیکن اکثر حالات میں محتاج نہیں ہوتے، لیکن بڑھاپے میں وہ محتاج ہوتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اسی طرح محتاج ہوں جس طرح اولاد اپنی شیرخوارگی اور طفولیت کے دور میں محتاج رہی ہے۔ اس وجہ سے اس سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کی اس شفقت و رحمت کو یاد کر کے جو انہوں نے اس کے بچپن میں اس پر کی ہے ان کے بڑھاپے میں ان کی خدمت کر کے ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے گا۔ پس مبارک ہے وہ فرزند جس نے یہ حق پہچانا اس لیے کہ اس نے جنت حاصل کرنے کی وہ راہ پالی جس سے زیادہ آسان راہ جنت حاصل کرنے کی اور کوئی نہیں ہے۔ انسانی فطرت میں شفقت اور رحمت کا جو جذبہ قدرت نے اولاد کے لیے والدین کے اندر رکھا ہے وہی جذبۂ رحمت و قربانی اولاد کے اندر والدین کے لیے رکھا ہے بشرطیکہ اولاد ان کے حق کو یاد رکھے۔ اگر کسی کے اندر یہ جذبہ مردہ ہو گیا ہے تو اس اعتبار سے وہ بدقسمت ترین انسان ہے کہ جنت حاصل کرنے کا وہ موقع اس نے کھو دیا جس سے زیادہ آسان موقع اس کو دوسرا ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔ یہی حقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں بیان ہوئی ہے:

عن ابی ھریرۃ، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: رَغِمَ انفہ۔ ثم رغم انفہ۔ ثم رغم انفہ۔ قیل: من؟	حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) فرمایا: اس کی ناک خاک آلود ہوئی! خاک آلود ہوئی!! خاک آلود ہوئی!!! سوال کیا گیا کہ کس

یارسول اللہ! قال: من	کی، یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: اس کی
ادرك والديه عند الکبر	جس نے اپنے ماں باپ کو، ان میں سے
احدهما او کليهما، ثم	کسی ایک کو یا دونوں کو، ان کے بڑھاپے
لم يدخل الجنة[1]	میں پایا، لیکن جنت حاصل نہ کر سکا۔

چوتھی نہایت اہم حقیقت یہ واضح ہوئی کہ والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی اگر عمر کی اس حد کو پہنچ جائیں جو ارذلِ عمر کہلاتی ہے، جس میں آدمی سمع و بصر اور ہاتھ پاؤں سے قاصر اور جملہ ضروریات میں دوسروں کا محتاج، بلکہ ان پر بوجھ بن کر رہ جاتا ہے تو گویہ امتحان اولاد کے لیے ایک بڑا ہی صبر آزما امتحان ہے، لیکن اس کی وفاداری اور سعادت مندی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے دل کے اندر نہ ان سے بیزاری پیدا ہونے دے اور نہ تنگ آکر کوئی کلمہ زبان سے ایسا نکال بیٹھے جو ان کی دل شکنی یا توہین کا باعث ہو۔ بلکہ سخت سے سخت حالات میں بھی وہی بات زبان پر لائے جو ایک بوڑھے ماں باپ کے لیے ایک شریف بیٹے کے شایان شان ہے۔ 'اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا' (بنی اسرآءیل - ۱۷ : ۲۳) (اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اُف کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو) کے ٹکڑے میں اسی امتحان سے آگاہ فرمایا ہے۔ لفظ 'اُف' عربی میں کسی چیز سے دل کی شدید بیزاری کی تعبیر ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے: 'اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ' (الانبیآء - ۲۱ : ۶۷) (تُف ہے تم پر بھی اور ان چیزوں پر بھی جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو)۔ اس کے بعد لفظ 'نہر' جو جھڑکنے کے معنی میں

---

[1] صحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ والأداب، باب ۳

آتا ہے اسی قلبی بیزاری کا گویا اظہار ہے۔ جب آدمی کے دل میں بیزاری پیدا ہو جائے تو لازماً لب ولہجہ میں خشونت اور کرختگی بھی پیدا ہو جائے گی۔ پھر جب یہ برقِ خرمن سوز بوڑھی ماں اور بے بس باپ کے نازک دل پر گرے گی تو ایک طرف تو یہ ان کے سارے خرمنِ امید کو جلا کر رکھ دے گی اور دوسری طرف اولاد کے سارے کیے کرائے کو بھی خاک میں ملا دے گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ جو چیز اس کے لیے جنت کی ضامن بن سکتی تھی وہ اس کے لیے ابدی نامرادی اور تباہی کا سبب بن جائے گی۔

یہ نفسیاتی حقیقت ہر شخص کو یاد رکھنی چاہیے کہ اولاد بچپن میں خواہ کتنی ہی شدید بیماری میں مبتلا ہو اور اس کے سبب سے ماں باپ کتنے ہی دکھ میں مبتلا ہوں، لیکن وہ انتہائی ناداری اور افلاس کے باوجود اولاد کو کبھی بار محسوس کر کے پھینکنے کے خواہاں نہیں ہوتے بلکہ اس کی صحت کی آرزو میں آخری لمحہ تک سینہ سے چمٹائے در در لیے پھرتے ہیں کہ شاید کسی ڈاکٹر یا حکیم کی نظرِ کرم ہو جائے اور اگر ڈاکٹروں اور حکیموں تک نہیں پہنچ پاتے تو سیانوں اور جھاڑ پھونک والوں ہی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ شاید انہی کی توجہ سے ان کا بجھتا چراغ روشن ہو جائے۔ اس جدوجہد میں وہ اپنے رات دن ایک کر دیتے ہیں۔ دوسرے خواہ کتنے ہی مایوس ہو جائیں، لیکن وہ مایوس ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کا یہ جذبۂ رحمت کوئی معمولی چیز نہیں ہے کہ اس کو بھلا کر کوئی شریف ابنِ شریف چین کی نیند سو سکے بلکہ وہ ان کے بڑھاپے میں، اپنی نمازوں میں، ان کے لیے برابر یہ دعا بھی کرے گا کہ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (بنی اسرائیل ۱۷- ۲۳:)

(اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا) اور ساتھ ہی ان کے ایک ایک سانس کو اپنے لیے دولتِ گراں مایہ سمجھے گا کہ ان کی خدمت کی ہر سعادت اس کے لیے جنت کی بشارت اور خوشنودیٔ رب کی ضمانت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

رِضَی الرَّبِّ فِی رِضَی الْوَالِدِ	اللہ تعالیٰ کی خوشنودی باپ کی خوشنودی
وَسَخَطُ الرَّبِّ فِی سَخَطِ	میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی باپ
الْوَالِدِ[1]	کی ناراضگی میں ہے۔

پانچویں حقیقت جو آیت کے آخری الفاظ: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (بنی اسرائیل ۱۷: ۲۴) (اور ان کے لیے رحم دلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جیساکہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا) سے نکلتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماں باپ کی خدمت واطاعت صرف رحمت کے جذبہ اور ان کی اس بے پایاں شفقت کے صلہ کی حیثیت سے ہونی چاہیے جو انہوں نے اولاد پر اس کے بچپن میں کی ہے۔ اس میں کسی ریا کی خواہش یا لوگوں کی ملامت کے اندیشہ یا ان کے اموال وجائداد کی طمع کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے، ورنہ جس طرح ریا کی عبادت اور غیر مخلصانہ اطاعت کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے اسی طرح یہ خودغرضانہ خدمتِ والدین بھی اس کے ہاں کسی صلہ کی حقدار نہیں ٹھہرے گی۔ اگرچہ یہ حقیقت کسی ایسے شخص کو سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہیں آسکتی جس کو دین کی باتیں سمجھنے کا کچھ ذوق ہو، لیکن کسی کو اس میں کچھ تردد ہو تو اسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ والدین کی صحیح خدمت کی راہ میں ایسا مرحلہ بھی پیش آنے کا امکان ہے جس میں اس شخص کے سوا کوئی دوسرا اس امتحان میں پورا اتر ہی نہیں سکتا جو اس محرک کے سوا جو اوپر مذکور ہوا کسی اور محرک کے تحت اس فرض کو انجام دینے کا ارادہ کرے گا۔ صرف ایک ہی چیز اس کو سخت سے سخت امتحان میں بھی پا برجا رکھ سکتی ہے کہ وہ یاد رکھے کہ اس کے ماں باپ کسی سخت سے سخت امتحان میں بھی اس کو چھوڑ کر کہیں بھاگنے

---

[1] سنن الترمذی: کتاب البر والصلۃ، باب ۳

والے نہیں بن سکتے تھے۔ درآنحالیکہ ان کو مجھ سے اس وقت کسی منفعت کی امید نہیں ہو سکتی تھی تو میرے لیے یہ بات کس طرح جائز ہو سکتی ہے کہ میں ان کی خدمت سے گھبرا کر انہیں چھوڑ بیٹھوں جب کہ میں ان سے کم یا زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی توقع بھی رکھتا ہوں۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اسلام میں ماں باپ کی خدمت ایک عظیم عبادت بھی ہے۔ اس امر کی وضاحت ایک حدیث سے ہوتی ہے:

عن عبد الله بن عمرو. قال: جاء رجل الی النبی صلی الله علیه وسلم یستاذنه فی الجهاد۔ فقال: احی والداك؟ قال: نعم. قال: ففیهما فجاهد۔[1]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں حصہ لینے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اس سے سوال کیا کہ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں، یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: تم ان کی خدمت کرو، تمہارے لیے یہی جہاد ہے۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ:

اقبل رجل الی نبی الله صلی الله علیه وسلم فقال: ابایعك علی الهجرة والجهاد، ابتغی الاجر من الله۔ قال: فهل من والدیك احد حی؟ قال: نعم۔ بل

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے آپ سے ہجرت اور جہاد پر بیعت کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی حیات ہے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں، دونوں

---

1 صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والأداب، باب ۱

كلاهما. قال: فتبتغى الاجر من الله؟ قال: نعم. قال فارجع الى والديك فاحسن صحبتهما۔[1]	ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا: تو اللہ تعالیٰ کے اجر کا طالب ہے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: تو اپنے والدین کے پاس لوٹ جاؤ اور ان کی خدمت کرو جیسا کہ خدمت کا حق ہے۔

اس خدمت کا یہ مزاج بھی مقتضی ہے کہ اس میں اخلاص کی شرط لازم ہو اس لیے کہ اسلام میں کوئی خدمت اخلاص کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب ١

آدمی کا تعلق اپنے کنبہ اور بیوی بچوں سے

انسان، جیساکہ پچھلے باب میں واضح ہو چکا ہے مدنی الطبع ہے، اس وجہ سے اس کے لیے ترک اور تیاگ، زہد اور انقطاع کی وہ زندگی جس کا تصور فلسفۂ رہبانیت میں پیش کیا گیا ہے بالکل خلاف فطرت ہے۔ مرد یا عورت جو بھی یہ زندگی اختیار کرے گا اس سے تربیت و اصلاح کی بجائے اس کو شدید نقصان پہنچے گا۔ ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں کہ انسان کی صلاحیتیں خاندان اور معاشرے کے سہارے پروان چڑھتی ہیں۔ اگر کسی داخلی یا خارجی سبب سے یہ سہارا اس کو حاصل نہ ہو سکے تو یہ سکڑ کے رہ جائیں گی۔ اگر مرد بیوی بچوں سے محروم ہو تو وہ ایک خانہ بدوش بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر عورت شوہر سے محروم ہو تو وہ ایک اجڑے ہوئے گھر کے مانند ہے۔ یہ حقیقت بھی یہاں پیش نظر رکھیے کہ جو چیز صرف کنبہ اور خاندان سے حاصل ہو سکتی ہے اس کا کسی مدرسہ یا خانقاہ سے حاصل ہونا ناممکن ہے۔

ممکن ہے یہاں کسی کو یہ شبہ ہو کہ سیدنا یحییٰؑ اور سیدنا مسیحؑ کے کامل العیار انسان ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی، لیکن معلوم ہے کہ ان جلیل القدر نبیوں نے عمر بھر تأہل کی زندگی اختیار نہیں کی۔ ہمارے نزدیک یہ شبہ بالکل بے بنیاد ہے۔ ان بزرگ نبیوں نے یہ زندگی اپنی پسند سے، مثالی زندگی سمجھ کر اختیار نہیں کی، بلکہ ان کے دور کے

حالات ہی ایسے تھے کہ یہ تنہائی ان کو اختیار کرنی پڑی۔ یہ دور وہ دور ہے جب بنی اسرائیل کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ خود ان نبیوں کے ارشادات کے مطابق یروشلم کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا اور اس کو خطاب کر کے یہ پیشین گوئی کی جا چکی تھی کہ یہاں کوئی اینٹ بھی دوسری اینٹ پر قائم نہیں رہنے دی جائے گی۔ ایسے پُرآشوب حالات میں گھر در بنانے اور بیوی بچوں کی زندگی اختیار کرنے کا شوق صرف وہی پورا کر سکتے تھے جو بالکل بے فکرے اور عاقبت سے بے پروا ہوں۔ اس دور میں حضرت یحییٰؑ کی زندگی اس طرح گزر رہی تھی کہ وہ یا تو جیل میں ہوتے یا بیت المقدس میں یہودی خونخواروں کے نرغے میں۔ اسی طرح سیدنا مسیحؑ شب میں جبلِ زیتون پر دعا اور آہ و زاری میں مصروف رہتے اور دن میں فریسیوں اور فقیہوں کے حصار میں مصروفِ مناظرہ۔ یہی دور ہے جس میں سیدنا مسیحؑ نے یروشلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ 'کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں مگر تم نے نہ چاہا[1]' غور کیجیے کہ جس کا پورا گلستان عذاب کی برقِ خرمن سوز کی زد میں ہو وہ آشیانہ بنانا چاہے بھی تو کون سی شاخ ہے جس کو وہ اس مقصد کے لیے انتخاب کر سکتا ہے! شاید یہی صورت حال ہے جس کا اظہار سیدنا مسیحؑ نے ان دلدوز الفاظ میں فرمایا کہ 'لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے مگر ابنِ آدم کے لیے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں[2]'

بہر حال گھر در بنانا اور بیوی بچوں والا بننا کوئی دنیاداری نہیں ہے، بلکہ خالق کے منشائے تخلیق، انسان کی مضمر صلاحیتوں کے ابراز اور اس کی تکمیلِ ذات کے لیے یہ فطرت

---

1 انجیل متی۔ باب ۲۳ : ۳۷

2 انجیل متی۔ باب ۸ : ۲۰

کے بدیہی مطالبات میں سے ہے۔ جنہوں نے اس کی مخالفت کی ہے انہوں نے فطرت سے جنگ کی ہے۔ مرد اور عورت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ دونوں مل کر ایک کنبہ کی بنیاد رکھتے ہیں جس کو انسانی معاشرہ کی تعمیر میں ایک یونٹ کی حیثیت حاصل ہے اور پھر بہت سے یونٹ مل کر ریاست کو وجود میں لاتے ہیں جو تمام تہذیب و تمدن کی معمار بنتی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ پہلی اینٹ بالکل ٹھیک رکھی جائے تاکہ پوری عمارت بالکل ٹھیک بنے۔ اگر اس میں کجی رہ جائے تو اندیشہ ہے کہ پوری عمارت کج ہو جائے۔ کسی نے کہا ہے: ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج!

اس کنبہ کی سربراہی یا قوّامیت کی ذمہ داری فطرت اور شریعت نے مرد پر ڈالی ہے، اس لیے کہ مرد ہی اپنی صلاحیتوں اور مزاجی خصوصیات کے اعتبار سے اس ذمہ داری کے اٹھانے کے لیے موزوں ہے۔ قرآن میں یہ حقیقت یوں واضح فرمائی گئی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ	مرد عورتوں کے سرپرست ہیں، بوجہ اس
بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ	کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت
عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا	بخشی ہے اور بوجہ اس کے کہ انہوں نے
مِنْ اَمْوَالِهِمْ	اپنے مال خرچ کیے۔
(النسآء — ۴ : ۳۴)	

اس آیت سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ کنبہ کی پرورش اور اس کی حفاظت و مدافعت بہتر طور پر مرد ہی کر سکتا ہے اس وجہ سے وہی موزوں ہے کہ اس پر قوّامیت کا بوجھ ڈالا جائے۔ یہ مرد کی مطلق فضیلت کا بیان نہیں، بلکہ قوّامیت کی ذمہ داری کے لیے عورت کے مقابل میں، مرد کی ترجیح کا بیان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض دوسرے اعتبارات سے

عورت کو مرد پر ترجیح حاصل ہو۔ مثلاً گھر گرہستی کی ذمہ داریاں جس خوبی سے عورت سنبھال سکتی ہے اور بچوں کی دیکھ بھال جس اعلیٰ پیمانہ پر وہ کرسکتی ہے کسی مرد سے متعلق اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا درآنحالیکہ کنبہ کے مقاصد میں ان چیزوں کی اہمیت بھی بنیادی ہے۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رکھیے کہ یہ بات مردوں اور عورتوں کی مزاجی خصوصیات کے اعتبار سے بطور ایک کلیہ ارشاد ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی عورت ایک مرد کے مقابل میں کمانے اور کنبہ کی کفالت کی زیادہ صلاحیت رکھنے والی ہو اور اس کے مقابل میں مرد اس صلاحیت سے عاری ہو۔ لیکن اس طرح کی انفرادی مثالوں سے کوئی کلیہ نہیں ٹوٹ جائے گا۔ اصل سوال مردوں اور عورتوں کی فطری صلاحیتوں، قوتوں اور طبعی رجحانات و میلانات کا ہے۔ کوئی انصاف پسند یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس میدان میں مرد اور عورت دونوں یکساں صلاحیت کے مالک ہیں۔ جدید تہذیب نے عورتوں کو مرد بنانے کی کوشش پر اپنا پورا زور صرف کر ڈالا ہے، لیکن اس کوشش میں اگر کوئی کامیابی حاصل ہوئی بھی ہے تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ بعض عورتیں اپنے تمام نسوانی اوصاف وفرائض سے کلیتہً دست بردار ہوجانے کے بعد کسی حد تک مردوں کی نقالی کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ سودا نہ ان عورتوں کے لیے نفع بخش ہوا ہے نہ مجموعی طور پر معاشرہ اور ملک کی حکومت کے لیے۔ چند مصنوعی مردوں کے بدلہ میں بہت سی حقیقی عورتوں کو کھو بیٹھنا کوئی دانش مندی کا کام ہرگز نہیں ہے۔

قوّامیت کی ذمہ داریاں اور فرائض :

اب آیئے دیکھیے کہ قوّامیت کے فرائض اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ بظاہر تو یہ مرد کے سر پر شرف کا ایک تاج ہے، لیکن اس کے ساتھ جو فرائض وابستہ ہیں ان پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تاج ہے تو سہی، لیکن کانٹوں کا تاج ہے اس لیے کہ مرد

اگر ان کا حق ادا نہیں کر سکے تو یہ اس کے لیے دنیا اور آخرت ، دونوں میں رسوائی کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہاں ہم ان فرائض اور ذمہ داریوں کا ، ایک مناسب ترتیب سے ذکر کرتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ان کا مطالعہ دوسروں کے فرائض کی حیثیت سے نہیں ، بلکہ اپنے فرائض کی حیثیت سے کریں گے۔

پرورش اور کفالت :

بیوی بچوں سے متعلق سب سے پہلی ذمہ داری تو مرد پر ان کی پرورش اور کفالت کی عائد ہوتی ہے۔ اوپر قوامیت والی آیت جو گزری ہے اس میں "بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ" (بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کیے) کے الفاظ صاف دلیل ہیں کہ مرد کو عورت پر جو قوامیت حاصل ہوئی ہے اس کے دو سببوں میں سے ایک بڑا سبب یہی ہے کہ وہ بیوی بچوں کی کفالت کا بار اٹھاتا ہے۔ یہ بار اٹھانا مرد کی مردانگی اور فتوت کا تقاضا ہے۔ قرآن نے مردوں کو عورت کے ساتھ معاملہ کرنے میں اپنی فتوت کی لاج رکھنے کی جگہ جگہ ہدایت فرمائی ہے۔ مثلاً مردوں کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ "وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَکُمْ" (البقرۃ - ۲ : ۲۳۷) (اور تمہارے درمیان ایک کو دوسرے پر جو فضیلت ہے اس کو نہ بھولو)۔ یعنی اس ترجیح کا تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت سے لینے والا نہ بنے ، بلکہ اس کی رجولیت کا تقاضا ہے کہ وہ اس کو دینے والا بنے۔ چنانچہ ہر معاشرے میں وہ مرد نکھٹو سمجھا جاتا ہے جو اپنی محنت سے اپنے بیوی بچوں کی کفالت نہ کر سکے اور اس بات کا تو مجبور کن حالات کے سوا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی مرد عورت کی کمائی پر تکیہ کرنے والا بنے۔

یہاں ایک نہایت اہم حقیقت یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد پر بیوی بچوں کی کفالت کی ذمہ داری تو ڈالی ہے ، لیکن اس کو ان کا رزاق نہیں بنایا ہے کہ وہ ان کے

مسائل پر اس پہلو سے سوچنا شروع کر دے کہ اس کے پاس کتنے بچوں کی کفالت کی گنجائش ہے، کتنے اس کی تحویل میں آچکے ہیں اور اب کسی نووارد کے لیے اس کے ہاں جگہ ہے یا نہیں؟ اس طرح کے سوالات پر غور کرنے والے جس طرح اپنے معیارِ زندگی اور اپنی آمدنی کو سامنے رکھ کر اپنے گھر کے بجٹ بناتے ہیں اسی طرح بچوں کی پیدائش سے متعلق بھی پروگرام بناتے ہیں۔ اگر ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی نومولود آکر ان کے بجٹ میں رخنہ انداز ہو سکتا ہے تو وہ اس کو روکنے کے لیے منعِ حمل اور اسقاط کے اسلحہ اور گولہ بارود لے کر میدان میں اتر آتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اس طرح کے بوالفضولوں کو خطاب کر کے متنبہ کیا ہے کہ کسی کنبہ کے سرپرست کو کبھی اس غلط فہمی میں نہیں مبتلا ہونا چاہیے کہ وہ ان کا رزاق ہے۔ ان کا رزاق ہونا تو درکنار کوئی اپنا بھی رزاق نہیں۔ رزاق سب کا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ	اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے
نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ج	قتل نہ کرو۔ ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے
(الانعام - ۶ : ۱۵۱)	ہیں اور ان کو بھی۔

اس آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو معاشی تنگ حالی کے ڈر سے بعض اوقات اپنی اولاد، خاص طور پر لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم صرف خدا کے بخشے ہوئے رزق کو تقسیم کرنے والے ہو، رزاق نہیں ہو کہ کسی کی زندگی یا اس کے رزق کو ختم کر دینے کا فیصلہ کرو۔ یہ فیصلہ رزاقِ حقیقی کا کام ہے جو سب کو رزق دیتا ہے۔

آیت کا مدعا یہ ہے کہ آدمی وہ کام کرے جو اس کے حدودِ کار کے اندر اور اس کے فرائض میں شامل ہیں: کسبِ رزق کے لیے جدوجہد کرے، وسائل کو ترقی دے، حاصل شدہ رزق کو کفایت شعاری اور انصاف کے ساتھ تقسیم کرے۔ اسی طرح بچوں کی پیدائش

کے معاملہ میں صحت، اعتدال، احتیاط اور میانہ روی کو ملحوظ رکھے۔ یہ کام اس کے کرنے کے ہیں۔ رہی یہ بات کہ کتنے بچے پیدا ہوں گے اور کتنا رزق حاصل ہوگا، یہ خدا کے کرنے کے کام ہیں، ان میں مداخلت کرنے والے احمق ہیں۔

کفالت کے باب میں اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کی ہدایت یہ بھی ہے کہ یہ کسبِ حلال سے ہو۔ کسبِ حرام سے جو کنبہ پلتا ہے وہ دنیا میں ممکن ہے کچھ چمک دمک دکھا جائے، لیکن بالآخر اس کے مقدر میں ایسی تاریکی ہے جس سے کبھی نجات ملنے والی نہیں ہے۔ آخرت میں اس کے سارے افراد ایک دوسرے پر لعنت کے دونگڑے برسائیں گے۔ ایسے کنبہ سے کسی رجلِ رشید کے پیدا ہونے کی توقع نہیں ہوتی۔ اگر کبھی آزر کے گھر میں کوئی ابراہیمؑ تقدیر سے پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اس بت خانہ کو منہدم کر کے لازماً دوسرا مقدس تعمیر کرتا ہے، لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔

اگر کسبِ حرام کی وبا کسی قوم میں عام ہو جائے تو وہ لازماً عذابِ الٰہی کی پکڑ میں آجاتی ہے۔ قرآن میں قومِ شعیب کی تباہی اس جرم میں بیان ہوئی ہے۔ اس زمانے میں چونکہ یہ وبا عالم گیر ہو چکی ہے اس وجہ سے صورتِ حال کچھ ایسی نظر آرہی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری دنیا یک قلم تباہ ہو جائے گی۔ یہود یانہ سرمایہ داری نے کمیونزم کا ایسا سرطان پیدا کر دیا ہے جس کا علاج اسلام کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے، لیکن اسلام ملا کے ہاتھ میں اسیر ہے اور اس کے نام لیوا نہ دنیا سے واقف نظر آتے ہیں، نہ دین سے۔

اس کفالت سے متعلق قرآن کی یہ ہدایت بھی یاد رکھیے کہ لازم ہے کہ اس میں نہ بخل ہو نہ تبذیر، بلکہ ہر پہلو سے یہ کفایت شعاری اور میانہ روی کا مظہر ہو۔ یہ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے رزق میں کشادگی بخشتا ہے اس کے اندر دوسرے مستحقین کے حقوق بھی ہوتے ہیں جو بطورِ امانت اس کی تحویل میں دیے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ جو فرمایا گیا ہے: وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ

(المعارج ۔ ۷۰ : ۲۴ - ۲۵) (اور وہ جن کے مالوں میں ایک معین حق ہوتا ہے سائلوں اور محروموں کا) اس سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حق کو حق کی حیثیت سے ادا کرنے کی توفیق وہی پا سکتا ہے جو اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے مصارف میں محتاط اور کفایت شعار ہوگا ورنہ وہ اپنے ہی شوق پورے نہ کر پائے گا تو دوسروں کے حقوق کا کیا خیال کرے گا جب کہ ان کی جانب سے اس کو کسی مطالبہ کا اندیشہ بھی نہیں ہے کہ رزق کی کشادگی ہوتے آدمی بیوی بچوں کے ساتھ بخالت اور کنجوسی کی روش اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو جب رزق کی کشادگی سے نوازے تو وہ چاہتا ہے کہ اس نعمت کا اثر اس کے دل کی شکر گزاری سے بھی ظاہر ہو اور اس کی زندگی سے بھی نمایاں ہو۔ کسی خوش حال آدمی کے بچے اگر پھٹے حال میں سامنے آئیں تو یا تو اس پر کنجوسی کا گمان ہوتا ہے یا بے سلیقگی کا اور ایسے گمان پیدا ہونے کا موقع دینا ہرگز کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے۔

تعلیم و تربیت :

دوسری بڑی ذمہ داری جو پہلی ذمہ داری سے کسی طرح کم نہیں ہے وہ بیوی بچوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بچے کی اصلی اور ابتدائی تربیت گاہ ماں باپ کی آغوش ہے۔ اس دور میں جو نقوش اس کی لوحِ قلب پر قائم ہو جاتے ہیں، خواہ وہ اچھے ہوں یا برے، وہ انمٹ ہوتے ہیں۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ: "ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ، فابواہ یھودانہ وینصرانہ ویمجسانہ"[1] (ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، یہ ماں باپ ہیں جو اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں)

---

[1] صحیح مسلم : کتاب القدر، باب ۶

ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے۔ ایک مرد کے لیے شادی کر لینا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے، لیکن یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ پیدا ہونے والے بچے اپنی بالکل ابتدائی تربیت گاہ میں ایسی تربیت کس طرح پائیں کہ ان کی فطرت نہ صرف یہ کہ مسخ ہونے سے محفوظ رہے، بلکہ وہ ٹھیک اس نہج پر پروان چڑھے جو اس کا فطری نہج ہے۔

یہ مسئلہ دوسروں کے لیے کچھ اہمیت رکھنے والا ہو یا نہ ہو، لیکن مسلمانوں کے لیے یہ نہایت اہم ہے، بالخصوص اس زمانے میں جب کہ معاشرے کا مزاج بالکل فاسقانہ ہے اور تعلیم و تربیت کے تمام ادارے بلا استثنار اتنے بگڑ چکے ہیں کہ ان کی نسبت اگر یہ کہا جائے تو ذرا غلط نہیں ہے کہ وہ زیر تربیت نسل کو شرارتوں میں کچھ چالاک تو بنا دیتے ہیں، لیکن دین اور اخلاق کو بالکل برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس معاشرہ کی اصلاح ہوگی یا نہیں؟ ہوگی تو کب ہوگی؟ تعلیمی اور تبلیغی نظام بدلے گا یا نہیں؟ بدلے گا تو کب؟ ان سوالوں کا جواب دینا میرا کام نہیں ہے۔ اگر یہ بدلے گا بھی تو ابھی اس میں اتنی دیر ہے کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ اس وجہ سے یہ سوچنا ضروری ہے کہ فوری طور پر، ہر درد مند مسلمان اور ہر مسلمان کنبہ کا سربراہ کی ذمہ داری اس کے بیوی بچوں سے متعلق کیا ہے؟

اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس بگڑے ہوئے زمانے میں کوئی شخص کچھ اور کر سکے یا نہ کر سکے، لیکن ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنے امکان اور صلاحیت کے حد تک اپنے بیوی بچوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کرے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ معاشرے کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے۔ کوئی بھاگنا چاہے بھی تو آخر کہاں جائے گا؟ اب وہوا کتنی ہی فاسد ہو چکی ہو، لیکن اسی میں جینا اور اسی میں مرنا ہے۔ موجودہ تعلیمی اور تربیتی اداروں سے بھی مفر نہیں ہے۔ اس لیے کہ ادارے قائم کرنا افراد کا کام نہیں ہے۔ معاشرہ اور حکومت کا کام ہے اور وہ اپنے مزاج کے مطابق ہی ادارے قائم کر سکتے ہیں۔ ایسے حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہر درد مند سربراہ کنبہ ایک طرف معاشرہ کی

اصلاح کے لیے جدوجہد کرے ـــــ جس پر ہم اگلے باب میں بحث کریں گا ـــــ
دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بیوی بچوں کو پوری دل سوزی و دردمندی کے ساتھ ان باتوں کی یاددہانی کرتا رہے جو ایمان کو زندہ رکھنے والی ہیں تاکہ وہ عنداللہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکے۔ اس فرض کا صحیح احساس اپنے اندر زندہ رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل باتوں پر ہر شخص کو نگاہ رکھنی چاہیے۔

گلہ کی حفاظت:

پہلی یہ کہ "الا کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہٖ"[1] (آگاہ رہو کہ تم میں سے ہر شخص چرواہا بنا دیا گیا ہے اور ہر ایک سے اس کے گلہ سے متعلق پرسش ہونی ہے) میں یہ آگاہی دی گئی ہے کہ ہر شخص کے بیوی بچے اس کی تحویل میں دیے ہوئے گلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس گلہ کا اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن اس کی نگرانی، اس کی چرواہی اور اس کی حفاظت اس نے سربراہِ کنبہ کے سپرد کی ہے اور ایک دن ـــــ قیامت کے دن ـــــ وہ دیکھے گا کہ کس نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور کس نے ادائے فرض میں کوتاہی کی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کسی کا اپنا گلہ نہیں ہے کہ چاہے وہ اس کی دیکھ بھال کرے یا نہ کرے، بلکہ یہ خالق و مالک کا گلہ ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ پوری مستعدی سے اس کی نگرانی کی جائے اور ٹھیک اس کے منشا کے مطابق کی جائے۔ اگر اس میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی اور غفلت کے باعث کوئی بھیڑ کھوئی گئی یا وہ بھیڑیے کے ہتھے چڑھ گئی تو اس کے لیے وہ لازماً مسئول ہوگا۔ یہ بات بھی یہاں یاد رکھیے کہ یہ معاملہ حیوانی گلہ کا

---

[1] صحیح مسلم: کتاب الامارۃ، باب ۵

نہیں، بلکہ انسانی گلہ کا ہے جس کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے جس سے بچنے اور بچانے کی تاکید اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ کی ہے اس وجہ سے ہر سربراہِ کنبہ پر سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے گلہ کو اس دشمن کی شب خونی سے بچانے کے لیے چوکنا رہے۔

مستقبل سے متعلق فکرمندی:

دوسری یہ کہ ہر شخص کو یہ حقیقت ہر لحہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اولاد کے ساتھ محبت اور شفقت یہ نہیں ہے کہ اس کو غلط روی کے لیے ڈھیل دی جائے، بلکہ یہ ہے کہ روزِ اوّل سے اس کی ایسی باتوں پر، جو کسی غلط رجحان کی نشان دہی کرتی ہوں، نہایت شفقت اور پیار کے ساتھ ٹوکا جاتا رہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اخلاق، آداب اور شریعت کے بنیادی احکام اس کے کانوں میں نہایت شفقت کے ساتھ اس طرح ڈالے جائیں کہ وہ بار نہ محسوس کرے۔ اس کا خیال نہ کیا جائے کہ وہ ان پر عمل کرتا ہے یا نہیں اس سے قطع نظر کر کے ضروری باتیں مناسب مواقع سے برابر اس کے کانوں میں پڑتی رہیں البتہ کہنے والے اس امر کا اہتمام رکھیں کہ خود ان سے ان باتوں میں سے کسی بات کی خلاف ورزی صادر نہ ہو۔ انسان کی فطرت بڑی اثر پذیر ہے۔ شفقت اور پیار کے ساتھ جو بات بتائی اور سکھائی جاتی ہے وہ ضرور اثر کرتی ہے بشرطیکہ عمل کا تسلسل جاری رہے اور تحکم و جبر سے احتراز کیا جائے۔ جو لوگ اپنی اولاد کی تربیت کے لیے یہ ریاضت کریں گے امید ہے کہ وہ اس برے زمانے میں بھی اس کو اس قابل بنا لیں گے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو وہ خوشی نصیب کرے جس کا ذکر سورۂ طور میں ہوا ہے۔ فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ	اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد
ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا	نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی
بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ	کی ان کے ساتھ ہم ان کی اولاد کو بھی

مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۚ (الطور - ۵۲ : ۲۱)

جمع کردیں گے اور ان کے عمل میں سے ذرا بھی کمی نہیں کریں گے۔

مطلب یہ ہے کہ اونچے درجہ کے اہلِ ایمان پر اللہ تعالیٰ یہ فضل فرمائے گا کہ ان کی باایمان اولاد کو ان کے بلند درجے میں ان کے ساتھ اکٹھا کر دے گا، اگرچہ اولاد اپنے عمل کے اعتبار سے اس درجہ کی سزاوار نہ ہو۔ یہ ان لوگوں پر خاص فضل ہوگا اور اس فضلِ خاص کی وجہ خود انہی کی زبانی یہ بیان ہوئی ہے کہ جب ان سے پوچھا جائے گا کہ یہ مرتبہ آپ لوگوں کو کس طرح حاصل ہوا کہ آپ کی اولاد بھی آپ کے ساتھ جمع کر دی گئی تو وہ جواب دیں گے:

قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝ (الطور - ۵۲ : ۲۶)

وہ کہیں گے کہ ہم اس سے پہلے اپنے اہل وعیال کے باب میں بڑے ہی چوکنے رہے ہیں تو اللہ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا اور ہمیں عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھا۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے بیوی بچوں کی عاقبت سے کبھی بے فکر رہ کر زندگی نہیں گزاری، بلکہ ہمیشہ خود بھی چوکنے رہے اور برابر ان کو بھی چوکنے رکھنے کی کوشش کی، یہ اس کا صلہ ہے کہ آج ہم کو اور ہماری اولاد کو یکجا کر دیا گیا ہے اور اس یکجائی کے لیے ہمارا درجہ نیچا نہیں کیا گیا، بلکہ ربِ کریم نے اپنے فضلِ خاص سے ان کا درجہ ہمارے برابر کر دیا۔ یہ اس کا فضل ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنے اہل وعیال کی عاقبت کی طرف سے بالکل بےچنت اور لاابالیانہ زندگی گزارتے ہیں خواہ اپنی بلادت کے سبب سے یا اپنے زعم میں یہ خیال کیے بیٹھے ہیں کہ اس عمر میں وہ ان کی آزادی اور بے فکری میں کیوں خلل انداز ہوں وہ اپنی اولاد کے ساتھ وہ دشمنی کر رہے ہیں جو کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کر سکتا اور ان کے اس رویہ پر سب سے زیادہ ان پر لعنت ان کی اولاد کرے گی۔ اگرچہ یہ سب کچھ بالکل بعد از

وقت ہوگا جس کا نفع کچھ نہیں ہوگا۔

بال سے زیادہ باریک، تلوار سے زیادہ تیز راہ :

تیسری یہ کہ ہر شخص کو یہ حقیقت ہر لحہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ بیوی بچے آدمی کے لیے صرف نعمت ہی نہیں، بلکہ بہت بڑی آزمائش بھی ہیں۔ ان کو پاکر جس طرح آدمی اس دنیا کی سب سے بڑی خوشی پالیتا ہے اسی طرح وہ ان کی صورت میں آخرت کے لیے بہت بڑا خطرہ بھی مول لے لیتا ہے اگر وہ ان کے اندر گم ہو کے رہ جائے اور ان خطرات و مہالک کا صحیح صحیح اندازہ نہ کرسکے جو ان سے اس کو پہنچ سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ معاملہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ نہایت کٹھن ذمہ داری ہے۔ اس کو صحیح طور پر وہی انجام دے سکتے ہیں جن کو توفیقِ الٰہی کا خاص بدرقہ حاصل ہو اور جو محبت اور نفرت، دونوں کے اندر حدودِ الٰہی کا احترام قائم رکھنے کا علم اور حوصلہ رکھتے ہوں۔ سورۂ تغابن کی یہ آیات ملاحظہ ہوں :

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ	اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور
اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ	تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے
فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَ	لیے دشمن ہیں تو ان سے بچ کے رہو اور
تَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ	اگر تم معاف کردگے، درگزر کردگے اور
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ	بخشوگے تو اللہ غفور رحیم ہے۔ تمہارے
وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ	مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے امتحان
عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝	ہیں اور اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔

(التغابن - ۶۴ : ۱۴ - ۱۵)

ان آیات سے واضح ہے کہ بیوی بچے آدمی کے لیے نعمت ہی نعمت نہیں ہیں، بلکہ وہ دشمن اور بہت بڑا فتنہ بھی اس کے لیے ہیں۔ غور کیجیے کہ ان کے دشمن ہونے کی صورت

کیا ہو سکتی ہے ؟ اس کا صحیح جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر وہ اس کو اپنے دامِ محبت میں اس طرح گرفتار کر لیں کہ وہ ان کی دل داری میں نہ خدا کے حدودِ حرام و حلال کی کوئی پروا کرے نہ دوسروں کے حقوق و فرائض کا اس کو کچھ احساس رہ جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے بیوی بچوں نے اس کو اپنے دامِ محبت میں پھنسا کر ہلاکت کی اس راہ پر ڈالا جس پر اس کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں ڈال سکتا تھا۔ پھر اس سے زیادہ نازک پہلو اس کا یہ ہے کہ اگر وہ ان کو دشمن سمجھ کر ان کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی ان کو کاٹ پھینکے تو یہ بھی کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کا اپنا گھر اجڑتا ہے اور آدمی ایسے جال میں پھنستا ہے جس سے نہ صرف اس کی بلکہ اس کی بیوی، بچوں اور عزیزوں، سب کی زندگی مستقل غم و الم کی نذر ہو کر رہ جاتی ہے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن! اگر بیوی بچوں کی خواہشوں کی تکمیل کرے تو مشکل اور اگر ان کو کاٹ پھینکنے کا ارادہ کرے تو مشکل! بیچ کی راہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیوی بچوں کی غلط خواہشوں کی تعمیل سے تو اسے بہر حال انکار کرنا ہے اس لیے ان کی خوشی کے لیے خدا کے غضب کو مول نہیں لیا جا سکتا۔ رہی بیوی بچوں کی برہمی تو جس حد تک ممکن ہو سکے ان سے درگزر کرے اور نباہ کرنے کی کوشش کرے، کوئی سخت قدم اس وقت تک نہ اٹھائے جب تک وہ یہ فیصلہ نہ کر لے کہ خدا اور ان کو بیک وقت راضی رکھنا ممکن نہیں رہا۔ آیات پر اچھی طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کا منشا یہی ہے کہ بندہ یہی راہ اختیار کرے، لیکن کیا یہ راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز نہیں ہے! الا ریب یہ راہ ایسی ہی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ بندہ بیوی بچوں کے معاملہ میں اس راہ پر چلنے کا امتحان پاس کرے: ؎

ہشدار کہ راہ بردمِ تیغ است قدم را!

یہاں ایک تفسیری نکتہ یہ بھی یاد رکھیے کہ سورۂ تغابن کے بعد سورۂ طلاق اور سورۂ تحریم

جاتی ہیں تو ان میں بالترتیب یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ زندگی کے ناگوار حالات کے اندر بندے کو کس طرح اللہ تعالیٰ کے حدود کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے اور خوش گوار حالات میں کس طرح ان کی پابندی کرنی چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں ہی حالتیں آدمی کے لیے مزلۂ قدم بنتی ہیں۔ محبت بھی آدمی کو اندھا بنا دیتی ہے اور نفرت بھی۔ مبارک ہے وہ بندہ جو ان دونوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔

نصیحت اور وصیت :

چوتھی یہ کہ آدمی ہر مناسب موقع پر بیوی بچوں کو نصیحت بھی کرتا رہے اور جس کو توفیق حاصل ہو وہ اپنے آخری لمحاتِ زندگی میں بھی ان کو وصیت کرے اور ان دونوں ہی چیزوں میں ان کی آخرت کی فکر مقدم رہے۔ نصیحت بھی رائگاں نہیں جاتی۔ بشرطیکہ وہ باتیں ملحوظ رہیں جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں اور اگر اس کا کچھ فائدہ بظاہر نہ بھی ہو تو یہ فائدہ کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ بری الذمہ قرار پائے گا۔ رہی وصیت تو وہ اکثر حالات میں مؤثر ہوتی ہے۔ اولاد میں ذرا بھی سعادت مندی کی رمق ہو تو وہ باپ کی آخری لمحاتِ زندگی میں کی ہوئی وصیت کی لاج رکھتی ہے۔ تورات اور قرآن، دونوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرات انبیائے کرام اور بزرگ اسلاف میں وصیت کی روایت رہی ہے۔ قرآن میں چند اہم وصیتوں کا حوالہ ہے۔ جن میں سے حضرت لقمان کی وصیت بڑی تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے لیے مثال کا کام دے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ	اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ
اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ	کے شکر گزار رہو اور جو شکر گزار رہے گا تو
فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ	اپنے لیے ہی رہے گا اور جو ناشکری کرے
كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝	گا تو اللہ بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ اور

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ
هُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ
بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ
عَظِيْمٌ ۝ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ
بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ
وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ
فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ
اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِنْ جَاهَدٰكَ
عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ
لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا
وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۫
وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ
ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰبُنَيَّ
اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ
مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ
صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي
الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝ يٰبُنَيَّ
اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ
وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ

یاد کرو جب کہ لقمان نے اپنے بیٹے
سے، اس کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ
اے میرے بیٹے! اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیو۔
بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے اور
ہم نے انسان کو اس کے والدین کے
معاملے میں ہدایت کی۔ اس کی ماں نے
دکھ پر دکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو
سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا کہ میرے
شکر گزار ہو اور اپنے والدین کے۔ میری ہی
طرف لوٹنا ہے۔ اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ
کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے باب
میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں تو ان کی بات
نہ مانیو اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک
رکھیو اور پیروی ان کے طریقہ کی کیجیو جو میری طرف
متوجہ ہیں۔ پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے اور میں جو کچھ
تم کرتے رہے ہو اس سے تم کو آگاہ کردوں
گا۔ اے میرے بیٹے! کوئی عمل اگر رائی کے
دانے کے برابر بھی ہوگا تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں
ہو یا آسمانوں یا زمین میں ہو اللہ اس کو حاضر
کردے گا۔ بے شک اللہ نہایت ہی
باریک بیں اور باخبر ہے۔ اے میرے بیٹے!

عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ	نماز کا اہتمام رکھو، نیکی کا حکم دو اور برائی سے
مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۚ وَلَا تُصَعِّرْ	روکو اور جو مصیبت تمہیں پہنچے اس پر صبر
خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ	کرو۔ بے شک یہ باتیں عزیمت کے کاموں
فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا	میں سے ہیں اور لوگوں سے بے رخی نہ کر
يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۚ	اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، اللہ کسی اکڑنے
وَاقْصِدْ فِىْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ	والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔
مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ	اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی
الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ	آواز کو پست رکھ۔ بے شک سب سے
(لقمٰن - ۳۱ : ۱۲ - ۱۹)	زیادہ مکروہ آواز گدھے کی آواز ہے۔

یہ لقمان، جہاں تک علم ہے، کوئی نبی نہیں تھے، بلکہ یہ عرب کے حکماء میں سے ایک جلیل القدر حکیم تھے اور غالباً ان کو ان کے علاقہ میں پدرسرانہ قسم کی سرداری بھی حاصل تھی ج قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے محسوس فرمایا ہے کہ اب ان کی ذمہ داریاں بیٹے کی طرف منتقل ہونے والی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ وصیت اتنی پسند آئی کہ یہ وحیٔ الٰہی کا ایک حصہ بن کر زندۂ جاوید بن گئی۔

آدمی کا تعلق غرباء و یتامیٰ اور پڑوسیوں سے

مومن ایمان سے فیض یاب ہو کر جس جگہ بھی بیٹھتا ہے اس کا بیٹھنا اس شجرۂ طیبہ کے مانند ہوتا ہے جس کی جڑیں پاتال میں اتری ہوئی اور شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی۔ اس کے خنک سایہ میں خلق پناہ لیتی ہے اور اس کے پھلوں اور پھولوں سے لوگ بہرہ یاب اور شادکام ہوتے ہیں۔ قرآن میں اس کی تعریف ' اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ' (ابراھیم - ۱۴ : ۲۴) (جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں) کے الفاظ سے کی گئی ہے۔ وہ ٹھونٹھ درخت کے مانند نہیں ہوتا جس میں نہ سایہ ہو نہ پھل، صرف بارِ زمین بن کے رہ گیا ہو اور نہ اس درخت کے مانند جو اپنے اردگرد زمین کی ساری صلاحیتیں ہضم کر کے موٹا تو ہو جائے، لیکن نہ اس کا سایہ خوش گوار ہو نہ اس کے پھل۔

ایک مومن کا فیض جس ترتیب و تدریج کے ساتھ اس کے ماحول میں بڑھتا اور پھیلتا ہے اس پر سورۂ نساء کی اس آیت سے نہایت عمدہ طریقہ پر روشنی پڑتی ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا	اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو
بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ	بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور والدین،
اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى	قرابت مند، یتیم، مسکین، قرابت دار

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ (النساء - ۴ : ۳۶)	پڑوسی، بے گانہ پڑوسی، ہم نشین، مسافر اور اپنے مملوک کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اللہ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیت پر تدبر کیجیے تو اس سے بہت سی حقیقتیں سامنے آئیں گی جن سے واضح ہوگا کہ ایک مومن کی زندگی پر اس کا ایمان کس نوعیت سے اثر انداز ہوتا اور درجہ بدرجہ کس طرح اس کو اردگرد کے لوگوں کے ساتھ حقوق اور فرائض کی لڑیوں میں پروتا چلا جاتا ہے۔

پہلی بات تو اس سے یہ سامنے آتی ہے کہ مومن پر سب سے بڑا حق اس کے رب کا ہے جو اس کا خالق اور تمام مادی و روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ حق بندگی، عبادت اور اطاعت کا ہے اور اس کی لازمی شرط یہ بتائی گئی ہے کہ یہ کامل اخلاص کے ساتھ ہو، اس میں کسی دوسری ذات یا کسی دوسری شے کو شریک نہ کیا جائے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد بندے پر سب سے بڑا حق اس کے والدین کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی پیدائش و پرورش میں جس نوعیت کا دخل ان کو ہے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو بھی نہیں ہے، لیکن یہ حق صرف احسان، فرماں برداری اور خدمت تک محدود ہے، خدا کے حقِ عبادت میں وہ بھی شریک نہیں کیے جا سکتے، بلکہ ان کو یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ اولاد کو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی تعمیل سے روک سکیں۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ والدین کے بعد قرابت داروں کا حق ہے خواہ وہ پدری رشتے سے قرابت دار ہوں یا مادری رشتے سے۔ یہ بھی حسنِ سلوک، محبت اور صلۂ رحم کے حق دار ہیں۔

چوتھی ایک نہایت دقیق حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ قرابت داروں کے بعد اس احسان میں یتامیٰ اور مساکین بھی شامل ہیں، ان کا ذکر اس طرح آیت میں آیا ہے گویا یہ بھی قرابت داروں ہی کے زمرہ میں شامل ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلامی معاشرہ میں یتامیٰ اور مساکین کو ہر آدمی اس نگاہ سے دیکھے گویا وہ اس کے عزیز و رشتہ دار ہیں اور اسی جذبہ سے ان کی خدمت اور سرپرستی کرے۔ خاص طور پر یتامیٰ سے متعلق تو یہ تصریح بھی قرآن میں آئی ہے کہ ان کے ساتھ صرف احسان کا نہیں، بلکہ اکرام کا سلوک کیا جائے: یعنی وہ کس مپرسی کی زندگی کے بجائے اسلامی معاشرہ میں سب کی آنکھوں کے تارے بن کر زندگی گزاریں اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے سب بیدار اور چوکنے رہیں۔

آیت کے آخر میں پڑوسی کا ذکر آیا ہے اور یہ ذکر اس طرح آیا ہے کہ آدمی سب سے پہلے قرآن کی اس آیت ہی سے یہ جانتا ہے کہ پڑوسی کا مفہوم کتنا وسیع ہے جن لوگوں نے مذاہب اور معاشرتی اخلاقیات کا مطالعہ کیا ہے وہ کوشش کے بعد بھی یہ سراغ نہیں دے سکتے کہ قرآن سے پہلے کسی مذہب نے بھی پڑوسی کا یہ تصور دیا ہو۔ چونکہ یہ مسئلہ معاشرتی پہلو سے غایت درجہ اہمیت رکھنے والا ہے، لوگ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ ہمارا یہی معاشرہ، جس کے ہر گوشہ میں جنگل کا قانون کارفرما ہے، جنت کے معاشرے کی مثال بن گیا ہے، اس وجہ سے ہم اس پر کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے۔

پڑوسی کی تین قسمیں:

عام طور پر لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ جس کا مکان ان کے مکان سے متصل اور جس کا دروازہ ان کے دروازے کے سامنے ہو وہ ان کا پڑوسی ہے، حالانکہ یہ صرف پڑوسی کی ایک قسم ہے۔ قرآن مجید نے تین قسم کے لوگوں کو آپ کے پڑوسی کا درجہ دیا ہے۔

پہلی قسم کا پڑوسی:

ایک پڑوسی وہ ہے جو آپ کا پڑوسی بھی ہے اور قرابت مند بھی ہے۔ قرآن نے اس کو 'جار ذی القربیٰ' سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا ذکر سب سے پہلے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ آپ کی ہمدردی اور مدد کا دوسرے پڑوسیوں سے زیادہ حق دار ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ تصریح بھی ہے کہ اگر اس کے خلاف دل میں کسی سبب سے کچھ کدورت بھی ہو جب بھی اس کو نظر انداز کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ اس طرح کے قرابت دار کے لیے جو انفاق کیا جائے گا اس کا اجر زیادہ ملے گا۔

یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہ حقوق جو بیان فرمائے ہیں ان میں ترتیب 'الاقدم فالاقدم' کی ہے اور اس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو ملحوظ نہ رکھے بلکہ اپنی خواہشات کی پاسداری میں اس کو الٹ پلٹ دے تو اندیشہ ہے کہ وہ اپنے انفاق سے کچھ اجر کمانے کے بجائے اس کو بالکل ضائع کر بیٹھے۔ فرض کیجیے، ایک شخص کو اپنے والدین کے حقوق کا تو کچھ خیال نہیں ہے، لیکن وہ اپنے پڑوسیوں کی لڑکیوں کے جہیز تیار کرانے میں بڑا فیاض ہے یا اپنے قرابت دار پڑوسی سے تو بے پروا ہے، لیکن دوسروں کی حمایت و ہمدردی میں بڑا سرگرم ہے تو گو اس کے یہ کام نیکی اور بھلائی کے ہیں، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی ترتیب کو بدل دینے کے سبب سے اپنا اجر کھو بیٹھے گا۔

دوسری قسم کا پڑوسی:

دوسرا پڑوسی وہ ہے جو اگرچہ آپ کا قرابت دار تو نہیں ہے، لیکن پڑوسی ہے۔ قرآن نے اس کو 'الجار الجنب' (اجنبی پڑوسی) سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اجنبیت رشتہ اور

قرابت نہ ہونے کے سبب سے بھی ہو سکتی ہے اور دینی اشتراک نہ ہونے کے باعث بھی ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے، وہ کوئی ہندو، عیسائی یا پارسی ہے اور آپ مسلمان ہیں۔ اس حیثیت کے باوجود وہ آپ کا پڑوسی قرار پائے گا اور از روئے قرآن یہ آپ کا فرض ہوگا کہ آپ اس کے حقوقِ جار کا احترام ملحوظ رکھیں۔ بعض صورتوں میں دین اور قرابت کی بنیاد پر کسی کو ترجیح و تقدیم تو حاصل ہو سکتی ہے، یہ ایک فطری اور عقلی چیز ہے، لیکن یہ ترجیح و تقدیم دوسرے کے واجبی حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ہوگی، ان کو نظرانداز کر کے نہیں ہوگی۔

تیسری قسم کا پڑوسی :

تیسری قسم کا پڑوسی وہ ہے جو عام مفہوم میں تو پڑوسی نہیں ہے، لیکن ریل میں، بس میں، ہوائی جہاز میں، ہوٹل میں، مجلس میں، مسجد میں، مدرسہ میں عارضی اور وقتی طور پر آپ کا ہم نشین یا ساتھی بن گیا ہے۔ قرآن نے اس کو 'الصاحب بالجنب' (ہم نشین) سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس کے لیے بھی اسی طرح احسان اور حسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی ہے جس طرح مذکورہ بالا قسم کے پڑوسیوں کے لیے فرمائی ہے۔ حالات اور مواقع کے لحاظ سے حسنِ سلوک اور ہمدردی کی صورتیں مختلف ہو جائیں گی۔ لیکن بہرحال آپ پر واجب ہوگا کہ آپ ہر جگہ اس کے لیے ایک شریف، کریم النفس اور قابلِ اعتماد ساتھی ثابت ہوں اور یہ چیز صرف ایک اخلاقی فضیلت کی حیثیت سے مطلوب نہیں ہے بلکہ آگے آپ دیکھیں گے کہ یہ ایمان کا بدیہی تقاضا ہے۔

پڑوسی کے حقوق کی اہمیت :

اب آیئے دیکھیے کہ پڑوسی کے حقوق کی اہمیت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح زور دیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضورؐ کا یہ ارشاد سامنے رکھیے جس کی روایت

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمائی ہے:

عن عائشۃ ان رسول اللہ	حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی
علیہ وسلم قال: ما زال جبریل	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریلؑ نے
یوصینی بالجار حتی	مجھے پڑوسی کے باب میں نصیحت کرنی شروع کی تو
ظننت انہ سیورثہ[1]	مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب وہ اس کو (پڑوسی کو) وراثت
	میں حصہ دار بنا دیں گے۔

پڑوسی کے حقوق کی عظمت و اہمیت کی اس سے زیادہ دل نشین تعبیر نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر چند وہ رحمی اور صلبی قرابت داروں کی طرح وراثت میں تو حصہ دار نہیں بنایا گیا ہے، لیکن اس کے حقوق کی اہمیت کے اعتبار سے اس کو یکے از آل جملہ سمجھنا چاہیے۔ اس کے ساتھ احسان و اکرام کا جو حکم دیا گیا ہے اس کو محض ایک فضیلت اور نیکی نہیں خیال کرنا چاہیے، بلکہ ایک حقِ واجب کی طرح ادا کرنا چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی سے متعلق حقوق و فرائض کی وضاحت مثبت اور منفی دونوں ہی پہلوؤں سے فرمائی ہے۔ یعنی یہ بھی بتایا ہے کہ اپنے آپ کو ایک اچھا پڑوسی ثابت کرنے کے لیے ایک مومن کو اپنے پڑوسی کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح کی باتوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ ان سب باتوں کی تفصیل میں طوالت ہوگی اس وجہ سے ہم تفصیل میں جانے کے بجائے دو اصولی باتیں عرض کرتے ہیں، امید ہے ان کی روشنی میں ہر طالب خیر خود تفصیل کو سمجھ لے گا۔

مثبت پہلو سے اصولی ہدایت:

مثبت پہلو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایت دی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] جامع الترمذی: کتاب البر والصلۃ، باب ۲۸

کے نزدیک بہترین پڑوسی وہ ہے جس کا معاملہ اپنے پڑوسی کے ساتھ بہترین ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے:

قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: خیر الاصحاب عند اللہ خیرھم لصاحبہ وخیر الجیران عند اللہ خیرھم لجارہ[1]	انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہترین رہا ہے اور بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہترین ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے بہترین ساتھی یا بہترین پڑوسی ہونے کا فیصلہ اس کے تعلقات اور روابط سے الگ کر کے نہیں ہوسکتا، بلکہ لازم ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ زندگی کے مختلف مراحل میں وہ جن کا ساتھی اور پڑوسی رہا ہے ان کے ساتھ اس کا معاملہ کیسا رہا ہے اور اس کے باب میں ان کی شہادت کیا رہی ہے یا کیا ہے؟ اگر اس اعتبار سے اس کا ریکارڈ اچھا ہے تو لاریب وہ بہترین ساتھی اور بہترین پڑوسی ہے اور اگر یہ چیز موجود نہیں ہے تو اس کی مدح سرائی میں آسمان وزمین کے قلابے ملانے سے کچھ حاصل نہیں۔ آدمی اپنے تعلقات ومعاملات سے پہچانا جاتا ہے۔ جو اس کسوٹی پر نہیں پرکھا گیا اس کے کھرے یا کھوٹے ہونے کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ جو اپنوں کے حقوق ادا کرنے میں ناکام رہا اس نے اگر دوسروں کے لیے فیض کے دریا بھی جاری کیے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔

یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھیے کہ ایک اچھے پڑوسی کے رویہ میں اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا سابقہ اچھے پڑوسیوں سے رہا ہے یا برے پڑوسیوں سے۔ اس کے پڑوسی اچھے ہوں جب بھی وہ اچھا رہتا ہے اور برے ہوں جب بھی وہ اچھا رہتا ہے۔ اس

---

[1] جامع الترمذی: کتاب البر والصلۃ، باب ۲۸

کی بہترین مثال خود ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مکی زندگی کے دور میں آپ بدترین پڑوسیوں کے نرغہ میں رہے، لیکن ان برے پڑوسیوں نے بھی آپ کے بہترین پڑوسی ہونے کی شہادت دی اور علی رؤوس الاشہاد اعتراف کیا کہ آپ بہترین ساتھی اور بہترین پڑوسی ہیں۔

منفی پہلو سے اصولی تلقین :

اسی طرح منفی پہلو سے بھی ایسی جامع ہدایتیں اس باب میں حضورؐ نے دی ہیں جو ہماری رہنمائی کے لیے بالکل کافی ہیں۔ مثلاً :

عن ابی شریح ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : واللہ لا یومن ! واللہ لا یومن ! واللہ لا یومن ! قیل : ومن ، یا رسول اللہ ؟ قال : الذی لا یامن جارہ بوائقہ[1]	ابو شریح سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کی قسم، وہ شخص ایمان نہیں رکھتا ! خدا کی قسم، وہ شخص ایمان نہیں رکھتا ! خدا کی قسم وہ شخص ایمان نہیں رکھتا ! سوال کیا گیا کہ کون یا رسول اللہ ؟ ارشاد ہوا : وہ جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی مامون نہ ہو۔

سب سے پہلے اس کلام کے تیور پر غور فرمائیے۔ آپؐ ایک بار نہیں، بلکہ تین بار اعادۂ قسم کے ساتھ، فرماتے ہیں کہ وہ شخص ایمان نہیں رکھتا ! ایمان نہیں رکھتا ! غور کیجیے کہ کتنی اہم اور ہولناک خبر ہے ! اس کو سن کر سب کے کان کھڑے ہو گئے ہوں گے، لیکن آپؐ نے اس کی وضاحت اس وقت تک نہیں فرمائی جب تک لوگوں نے سوال نہیں کیا کہ ایسا محروم الایمان کون ہے، یا رسول اللہ جس کے ایمان کی اس شدت

---

[1] صحیح البخاری : کتاب الادب، باب ۲۹

کے ساتھ نفی فرمائی جا رہی ہے! ظاہر ہے کہ یہ طریقہ آپؐ نے اس لیے اختیار فرمایا کہ ہر شخص اس بات کو سُنے اور کان کھول کر سُنے۔

اس کے بعد اس بات پر غور فرمایئے کہ آپؐ ایمان کے لیے اس تاکید کے ساتھ صرف اس شرط کو ضروری نہیں قرار دیتے کہ ایک مومن کے پڑوسی اس کی ایذاء اور تعدی سے محفوظ رہیں، جیسا کہ بعض روایات میں یہ بات بیان ہوئی ہے، بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ اس کے پڑوسی اس کی طرف سے ہر اندیشہ سے بالکل بےخوف رہیں۔ یہ بات صرف اس شکل میں ممکن ہے جب انھوں نے ہر قسم کے نرم و گرم حالات میں تجربہ کر کے اس کی شرافت و فتوت اور اس کی کریم النفسی اور حق شناسی کا ایسا تجربہ کر لیا ہو کہ انہیں یہ پورا اطمینان ہو کہ خواہ کچھ ہی ہو جائے، لیکن اس شخص کو کوئی خوف اور کوئی طمع اس کے ادائے فرض سے روک نہیں سکتی۔ اگر کوئی امتحان پیش آگیا تو یہ اپنی جان تو قربان کر دے گا، لیکن اپنی فتوت پر آنچ نہیں آنے دے گا۔

یہاں یہ امر بھی پیش نظر رکھیے کہ پڑوسی چونکہ ہر وقت کا ساتھی ہے اس وجہ سے اطمینان یا بے اطمینانی پیدا کرنے میں جو حصہ اس کا ہو سکتا ہے کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر نقصان پہنچانا چاہے تو آپ کی ہر غفلت اور ہر کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگر آپ کی مدد کرنا چاہے تو وہ گویا آپ کی آنکھ، آپ کا کان اور آپ کا اپنا دست و بازو ہے۔ دور والے اگرچہ کوئی بڑی سے بڑی مدد پہنچا سکنے کے پوزیشن میں بھی ہوں، لیکن وہ اچھے پڑوسی کے نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ آدمی کو بسا اوقات اپنے جان و مال سے زیادہ اپنے عزت و ناموس کے لیے فکرمند ہونا پڑتا ہے اور یہ چیز ایسی ہے جس میں ایک شریف پڑوسی سے جس طرح بڑی سے بڑی مدد مل سکتی ہے اسی طرح ایک کمینہ پڑوسی سے بڑا سے بڑا خطرہ بھی پہنچ سکتا ہے۔

آدمی کا تعلق معاشرہ سے

آدمی ایک اثر پذیر ہستی ہے اور یہ اثر پذیری اس کی ایک نہایت اعلیٰ صفت ہے۔ اس کے فیض سے وہ اپنے بڑوں کے طور طریقے اور ان کے آداب و افکار اپناتا ہے اور پھر ان کو اپنے بعد والوں کی طرف منتقل کرنے والا بنتا ہے۔ یہ نہ ہو تو آدمی ایک پتھر بن کر رہ جائے، نہ پچھلوں سے کچھ لینے والا بن سکے نہ اگلوں کو کچھ دینے والا۔ لیکن اس خوبی کا ایک خطرناک پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس کی بدولت وہ جس طرح دوسروں کے اچھے عادات و اطوار کی چھاپ قبول کر لیتا ہے اسی طرح ان کی بری روایات اور ان کے بُرے آثار کے نقوش بھی قبول کر لیتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو نہایت خطرناک ہے۔ اس کے سبب سے اس کا پورا اندوختہ، اگر وہ اس کی برابر چھان پھٹک نہ کرتا رہے، رطب و یابس کا ایک انبار بن کے رہ جاتا ہے۔ بچپن میں تو اس چھان پھٹک کی صلاحیت نہیں ہوتی اس وجہ سے وہ ماں باپ کے ڈالے ہوئے اثر کو قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے: "ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ وینصرانہ ویمجسانہ"[1] (ہر بچہ پیدا تو ہوتا ہے فطرتِ اسلام پر، لیکن

---

[1] صحیح مسلم، کتاب القدر، باب معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ۔

اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں)۔ لیکن سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد آدمی کے عقلی ہستی ہونے کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ وہ اس سارے ذخیرے کو جو اس کو آباء و اجداد سے ملا ہے جائزہ لے کر دیکھے کہ اس میں کتنا حق ہے، کتنا باطل۔ اگرچہ باپ دادا کے طریقہ سے آدمی کو نہایت گہرا انس ہوتا ہے، اس کو وہ آسانی سے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر عاقل و بالغ کے لیے یہ امتحان رکھا ہے کہ وہ مجرّد اس وجہ سے کسی طریقہ پر جما نہ رہے کہ وہ اس کے باپ دادا سے چلا آ رہا ہے، بلکہ اس کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھے کہ وہ اس کو قبول کرتی ہے یا نہیں اور اس کے باپ دادا ہدایت پر تھے یا گمراہی پر قرآن میں ارشاد ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝	اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہِ ہدایت پر رہے ہوں؟
(البقرۃ - ۲ : ۱۷۰)	

اس سے معلوم ہوا کہ کسی طریقہ کے اچھے ہونے کی مجرّد یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ باپ دادا کا طریقہ ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ باپ دادا نے اس طریقہ کو اندھی تقلید کی بنا پر اختیار کیا ہے یا سمجھ بوجھ کر۔ اگر یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ باپ دادا بڑے لکیر کے فقیر رہے ہیں اس نے ان کی پیروی کی تو اس کی مثال اس اندھے کی ہوگی جس نے دوسرے اندھے کو اپنا عصا کش یا رہنما بنا لیا۔

باپ دادا کے طریقہ کے سند ہونے کی دوسری شکل یہ ہے کہ اطمینان بخش دلائل سے

یہ علم ہو کہ ہمارے اسلاف میں فلاں گروہ ہدایت یافتہ گروہ رہا ہے۔ مثلاً ہم پورے اطمینان قلب کے ساتھ جانتے اور مانتے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے اصحاب (رضی اللہ عنہم) اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی سیدھی راہ پر تھے۔ اپنے اس اطمینان کی بنا پر ہم ان کے طریقہ کو سند مانتے ہیں اور بسا اوقات ان لوگوں کے طریقہ کو سند نہیں مانتے جو ان کے بعد ہوئے اگرچہ باپ دادا ہونے کے اعتبار سے وہ پہلوں کے مقابل میں ہم سے قریب تر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ مجرد باپ دادا کا طریقہ ہونا کسی بات کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، بلکہ حق ہونے کے دلائل اس سے الگ ہیں۔ حق کے طالب کو نگاہ ان پر جانی پڑتی ہے۔

زندگی پر معاشرے کے ان گہرے اور دیرپا اثرات کے سبب سے ہر عاقل و بالغ پر اس سے متعلق چند نہایت اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کا تقاضا انسان کی عقل بھی کرتی ہے اور ان کا حکم شریعت نے بھی دیا ہے۔ ہم یہاں بالاجمال ایک مناسب ترتیب سے ان کا ذکر کریں گے۔

مرحلۂ دعوت :

پہلی ذمہ داری ہر ذی ہوش پر یہ ہے کہ وہ معاشرہ کے بناؤ اور بگاڑ سے بے تعلق نہ رہے، بلکہ جو خرابی بھی اس کے اندر سر اٹھاتی نظر آئے، اپنے امکان اور صلاحیت کے حد تک اس کو روکنے کی کوشش کرے۔ اگر یہ خیال کر کے کہ پرائے جھگڑے میں پڑ کر اپنے لیے کیوں مصیبت خرید لے، کوئی شخص اپنا فرض ادا کرنے سے گریز کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ اس کی اس سہل انگاری کے نتیجہ میں جو برائی جڑ پکڑے گی ہو سکتا ہے کہ وہ پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور ایک دن اس کا خمیازہ اس کو بھی اور اس کی آئندہ نسلوں کو بھی بھگتنا پڑے۔ آج تو امکان ہے کہ معمولی کوشش سے معمولی مخالفت کا مقابلہ کر کے اس فتنہ کو دبایا جا سکے،

لیکن کل کو شاید سر دے کر بھی اس کو دبانا ممکن نہ رہے۔

یہ حقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کشتی کے مسافروں کی تمثیل سے سمجھائی ہے کہ جس طرح ایک کشتی میں کچھ لوگ اس کے اوپر کے حصہ میں سفر کرتے ہیں اور کچھ اس کے نیچے کے حصہ میں، لیکن کشتی کی سلامتی کی فکر دونوں کو کرنی پڑتی ہے۔ نہ اوپر والے نیچے والوں کے کسی غلط اقدام سے بے پرواہ رہ سکتے، نہ نیچے والے اوپر والوں کے کسی نقصان رساں فعل سے اغماض برت سکتے۔ اگر ایسا کریں تو دونوں تباہ ہو سکتے ہیں۔ فرض کیجیے نیچے والے یہ سوچ کر کہ ان کو پانی لینے کے لیے بار بار اوپر جانے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے تو کیوں نہ وہ کشتی کے پیندے میں سوراخ کر کے اپنے لیے پانی کا انتظام کرلیں اور اوپر والے یہ خیال کر کے کہ وہ اپنے حصہ میں سوراخ کر رہے ہیں تو یہ پرائے قضیہ میں کیوں مداخلت کریں ان کو جو کچھ وہ چاہتے ہیں کرنے کے لیے چھوڑ دیں تو جب اس عمل کے نتیجہ میں کشتی ڈوبے گی تو اوپر اور نیچے، دونوں حصوں کے مسافروں کے ساتھ ڈوبے گی۔

یہی حال ایک معاشرہ کے افراد کا ہے۔ اگر اس کے کچھ افراد کسی برائی کی نیو ڈالیں اور دوسرے جو ان کو سمجھانے یا روکنے کی پوزیشن میں ہیں ان کے ہاتھ نہ پکڑیں، اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر یا کسی خوف اور مصلحت کے سبب سے، اس سے بے تعلق رہیں تو ہو سکتا ہے کہ اس سے جو شر پیدا ہو ایک دن وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور پھر اس کے آخری نتیجہ کے طور پر اگر خدا کا کوئی قہر نازل ہو تو وہ سب کو فنا کر دے۔

یہ ذمہ داری بحیثیت ایک ذمہ داری کے تو معاشرہ کے تمام افراد پر عائد ہوتی ہے، لیکن اس کے ادا کرنے میں چونکہ صلاحیت بھی درکار ہے اس وجہ سے جتنی جس کے اندر صلاحیت ہوگی اسی مقدار میں اس کی ذمہ داری ہوگی۔ اگر ایک شخص برائی کو روک دینے کا اختیار رکھنے والا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس کو روکنے کے لیے اپنا اختیار استعمال کرے۔ اگر ایک شخص اختیار یا اثر تو نہیں رکھتا، لیکن زبان یا قلم سے اس کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے تو

وہ اس کے خلاف زبان اور قلم سے جہاد کرے۔ اگر کوئی شخص یہ صلاحیت بھی نہیں رکھتا تو ادنیٰ درجہ میں اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کو اپنے دل میں برا سمجھے اور اپنے آپ کو اس کے ہر شائبہ سے دور رکھے۔ اس آخری درجہ سے متعلق انکار منکر والی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ "لیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل"[1] (اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ رائی کے دانہ کے برابر بھی نہیں ہے)۔

یہ معاشرہ کے ہر فرد پر معاشرہ کا ایک حق ہے جس کو ادا کرنا واجب ہے۔ یہ کوئی احسان نہیں ہے کہ جی چاہا کیا، جی نہ چاہا تو ٹال دیا۔ جس طرح ہر فرد پر اس کے ماں باپ اور بیوی بچوں کے حقوق ہیں جن کو ادا کرنے کی کوشش کرنا اس پر لازم ہے اسی طرح معاشرہ کے بھی ہر شخص پر اس کی صلاحیت کے مطابق حقوق ہیں جن کو ادا کیے بغیر کوئی شخص خلق اور خالق کے آگے سرخرو نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ حقیقت بھی یاد رکھیے کہ یہ جو حقوق معاشرہ کے ہیں وہ معاشرہ ہی کو ادا کرنے سے ادا ہوں گے دوسروں کو ادا کرنے سے ادا نہ ہوں گے۔ اگر دعوتِ دین کا علم اٹھا کے آپ امریکہ اور افریقہ کے سفر کے لیے تو روز پا بہ رکاب رہتے ہیں، لیکن وہ گمراہی جو آپ کی اپنی قوم کے گھر گھر میں پھیلی ہوئی ہے آپ کو نظر نہیں آتی یا اتنی سنگین نظر نہیں آتی جتنی امریکہ کی نظر آتی ہے تو آپ کی یہ حق تلفی آپ کی اس نیکی کی وجہ سے جو آپ باہر کرتے ہیں کچھ ہلکی نہیں ہو جائے گی۔ بلکہ آپ کی مثال اس شخص کی ہوگی جو اپنے بیرونی دوستوں کو آئے دن ہوٹلوں میں ڈنر پر بلانے اور ان کے ڈنر میں جانے کے لیے تو بڑا فیاض ہے، لیکن اس کے اپنے بیوی بچے گھر میں بھوکے ہوتے ہیں۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے کہ میرے پاس جو روٹی ہے وہ بچوں ہی کے لیے ہے اس کو کتوں کے آگے ڈالنا ٹھیک نہیں ہے۔

---

[1] صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب کون النھی عن المنکر من الایمان

پس داعیانِ دین پر یہ حقیقت واضح ہونی چاہیے کہ یہ کوئی تجارت نہیں ہے کہ اس کے لیے میدان دنیوی نفع و نقصان کو پیشِ نظر رکھ کر تلاش کیا جائے بلکہ یہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اپنے معاشرہ سے متعلق ایک فرض ہے جو ہر اس شخص پر عائد ہوتا ہے جو معاشرہ کی کسی خدمت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس فرض کو اپنے ہی معاشرہ کے اندر ادا کرنا ہے، خواہ اس کی زمین کتنی ہی بنجر ہو۔ یہ آپ کے اوپر معاشرہ کا ایک قرض ہے جو اسی کو ادا کرکے آپ اس سے سبک دوش ہو سکتے ہیں۔ اس باب میں حضرت انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت تو یہ ہے کہ انہوں نے اسی معاشرہ کو اپنی تمام دعوتی سرگرمیوں کا میدان بنایا جس کے اندر سے وہ اٹھے اور اس وقت تک اس میدان میں ڈٹے رہے جب تک ان کو وہاں سے ہٹنے کی اجازت نہ ملی۔ کسی نبی کے متعلق بھی یہ بات علم میں نہیں آئی ہے کہ اس نے اپنا معاشرہ چھوڑ کر دعوت کے لیے دوسرے جزیروں کی تلاش میں خشکی اور تری کا سفر کیا ہو۔ انہوں نے اپنے معاشرہ سے باہر قدم اسی وقت نکالا جب اللہ تعالیٰ نے ان کو ہجرت کا حکم دیا ہے اور یہ حکم ان کو اس وقت دیا گیا ہے جب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اس معاشرہ کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے۔

معاشرہ کی یہ خدمت چونکہ اس کے ایک واجب حق کی حیثیت سے کی جاتی ہے اس وجہ سے اس کا کوئی صلہ اس سے نہیں چاہا جاتا۔ چنانچہ تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یہ اعلان ہوا ہے کہ "وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (الشعراء۔ ۲۶:۱۰۹) (اور اس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو عالم کے خداوند کے ذمہ ہے) اسی طرح بعض نبیوں سے یہ بھی ماثور ہے کہ "ہم نے مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہے ہیں" داعیانِ حق کی یہی بے غرضی اس دعوت کی اصل امتیازی صفت رہی ہے، اور ایسے ہی داعیوں نے دین کی خدمت کی توفیق پائی ہے نہ کہ گداؤں نے جو کشکولِ گدائی لیے مشرق و مغرب کے چکر لگاتے پھرتے ہیں۔

اس دعوت کے باب میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے صالح متبعین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ کسی نے ان کی بات سنی یا نہیں سنی، لیکن انھوں نے اپنی دعوت اس وقت تک جاری رکھی جب تک اس کا امکان پایا۔ یہ نہیں ہوا کہ چند دن کام کرنے کے بعد اگر اندازہ ہوا کہ یہ زمین کچھ زیادہ زرخیز نہیں ہے تو وہاں سے خیمے اکھاڑ کسی اور مقام پر ڈیرے ڈال دیے۔ ان کی جدوجہد کا انحصار لوگوں کے التفات پر نہیں، بلکہ اپنے ادائے فرض پر رہا۔ انھوں نے اپنا محاذ اسی وقت بدلا ہے جب ان پر واضح ہو گیا کہ اس محاذ پر اپنے فرض سے وہ سبک دوش ہو گئے۔

قرآن مجید میں ان داعیانِ اصلاح کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جو سبت کی بے حرمتی کرنے والوں کی اصلاح کے لیے اٹھے تھے۔ ایک مدت کی دعوت کے بعد بھی جب ان کی بات پر کسی نے کان نہیں دھرے تو ان کے بعض ساتھیوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہا کہ جو لوگ اتنے قسی القلب ہیں کہ کوئی بات سننے کے روادار ہی نہیں ان کے پیچھے وقت برباد کرنے سے کیا حاصل؟ یہ سوال اور اس کا جواب سورۂ اعراف میں یوں نقل ہوا ہے:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ (الاعراف - ۷: ۱۶۴)	اور یاد کرو جب کہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کیے جا رہے ہو جنھیں یا تو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انھیں ایک سخت عذاب دینے والا ہے۔ وہ بولے کہ یہ اس لیے کہ یہ تمہارے رب کے سامنے ہماری طرف سے عذر بن سکے اور تاکہ یہ خدا کے غضب سے بچیں

ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں اپنا مشن اصلاً تو اس لیے جاری رکھنا ہے کہ ہمارا عذر

عنداللہ واضح ہو جائے کہ ہم نے معاشرہ کی اصلاح سے متعلق اپنی ذمہ داری، قطع نظر اس سے کہ لوگوں نے ہماری بات سنی یا اپنے کان بند رکھے۔ علاوہ ازیں امکان اس کا بھی ہے کہ شاید کسی مرحلہ میں یہ کان کھولیں اور توبہ و اصلاح کر کے اپنے کو اللہ کے عذاب سے بچانے کی فکر کریں۔ ہم غیب نہیں جانتے اس وجہ سے ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم اپنے کام میں لگے رہیں اور لوگوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑیں۔

رہا یہ سوال کہ معاشرہ کے مصلحین کے لیے کب یہ جائز ہوتا ہے کہ وہ اس سے اعلانِ براءت کر کے علیحدہ ہوں تو اس کا جواب قرآن حکیم کی روشنی میں یہ ہے کہ جہاں تک رسولوں کا تعلق ہے ان کے لیے براءت کے اعلان کا وقت خود اللہ تعالیٰ مقرر کرتا ہے۔ وہ اللہ ہی کی طرف سے ایک محاذ پر مامور کیے جاتے ہیں اس وجہ سے ان کے لیے اس وقت تک ہٹنا جائز نہیں ہے جب تک وہی ان کو اجازت نہ دے۔ قرآن مجید میں حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق بیان ہوا ہے کہ ایک مدت تک وہ اپنی قوم کو دعوت دیتے رہے، لیکن کسی نے ان کی بات نہ سنی۔ بالآخر وہ قوم کو چھوڑ کر چلے گئے کہ جو لوگ اتنے ناقدرے ہیں کہ حق بات ان کو سننی ہی گوارا نہیں ان کے آگے حق کو پیش کر کے اس کی ناقدری کرانے سے کیا حاصل! اگرچہ حضرت یونس علیہ السلام کا یہ اقدام غیرتِ حق کے جوش میں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ اس کے نتیجہ میں ان کو ایک سخت ابتلاء سے سابقہ پیش آیا۔ جس سے ان کو بڑے توبہ و استغفار کے بعد رہائی ملی۔ پھر اس رہائی کے بعد حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم میں واپس جا کر دعوت کے کام کو از سرِ نو شروع کریں جس کو چھوڑ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے چنانچہ وہ قوم میں واپس گئے اور ان کی اس دوبارہ دعوت سے اللہ تعالیٰ کی یہ شان ظاہر ہوئی کہ ان کی پوری قوم ملک کے بادشاہ سمیت ایمان سے مشرف ہو گئی۔

رسولوں کے سوا دوسرے لوگ جو رسولوں کے طریقہ پر کام کرتے ہیں ان کے لیے قرآن نے اصحابِ کہف کے واقعہ میں یہ رہنمائی دی ہے کہ ان کو اس وقت تک اپنی قوم کے

اندر اپنے مشن میں لگے رہنا چاہیے جب تک وہ اس کو جاری رکھنے کا امکان پائیں۔ جب وہ یہ دیکھیں کہ دشمنوں نے ان کے لیے تمام راستے بند کر دیے ہیں اور اب اگر ایک قدم بھی ان کی مرضی کے خلاف اٹھایا گیا تو اندیشہ ہے کہ ان کی زندگی اور ان کی دعوت، دونوں آخری خطرہ سے دوچار ہو جائیں تب ان کے لیے جائز ہوتا ہے کہ جدھر بھی ان کو کوئی راہ نظر آئے اُدھر کے لیے، اللہ کے بھروسہ پر، اٹھ کھڑے ہوں۔ یہاں تک کہ اگر کسی غار میں پناہ لینی پڑ جائے تو یہ بھی کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں بھی ان کے لیے روشنی اور اسباب زندگی مہیا کرے گا۔ یہ بات یاد رکھیے کہ قرآن مجید میں یہ تصریح موجود ہے کہ اصحاب کہف نے غار میں پناہ اس وقت لی ہے جب ان کی قوم نے ان کو یہ آخری دھمکی دے دی ہے کہ اب یا تو اپنے باپ دادا کے دین پر واپس آجاؤ ورنہ ہم تمہیں سنگسار کردیں گے

مرحلۂ ہجرت :

اس زمانے میں جو لوگ دعوتِ دین کے دعوے کے ساتھ اٹھتے ہیں وہ پیدا ہوتے ہی لوگوں سے ہجرت اور جہاد کی بیعت لینی شروع کر دیتے ہیں۔ غلبۂ اسلام کا موضوع ایک عوام پسند موضوع ہے اس وجہ سے وہ پہلا ہی قدم آخری منزل کے لیے اٹھاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لوگ غلبۂ اسلام کے لیے انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہیں، اب ان کو مزید انتظار کی زحمت نہیں دینی چاہیے۔ ان بے خبر جلد بازوں کو کون بتائے کہ ان کی جلد بازی کی وجہ سے راہ کے عقبات اور مراحل طے نہیں ہو جائیں گے۔ ہوگا یہ کہ یہ اپنی بے علمی اور حماقت کی وجہ سے ان ناکامیوں کی فہرست میں ایک اور عبرت انگیز اضافہ کریں گے جو پہلے ہی سے کافی طویل ہے۔

ہجرت سے متعلق پہلی بات تو یہ یاد رکھیے کہ یہ ہر دعوت کے لوازم و واجبات میں سے نہیں ہے کہ پہلے ہی دن سے اس کے لیے بیعت لینا ضروری ہو۔ اوّل تو، جیسا کہ ہم

نے اوپر واضح کیا، اس کا مرحلہ اس وقت آتا ہے جب داعی اپنے فرضِ دعوت سے سبک دوش ہو چکا ہو، دوسرے یہ کہ ہر داعی کے لیے اس مرحلہ کا پیش آنا ضروری نہیں ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے جو صرف نبی تھے، رسول نہیں تھے، ان میں سے کسی کے متعلق بھی معلوم نہیں ہے کہ ان کو یہ مرحلہ پیش آیا ہو، یہاں تک کہ ان میں سے بعض کو مقدس کے عین منبر و محراب کے درمیان قتل کر دیا گیا، لیکن یہ جانتے ہوئے کہ ان کی جان خطرے میں ہے انہوں نے ہجرت نہیں کی۔ البتہ رسولوں کو یہ مرحلہ پیش آیا ہے، لیکن ان میں سے بھی ہر ایک کے متعلق دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو اس مرحلہ سے گزرنا پڑا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس سیدنا یونسؑ کے واقعہ سے، جو اوپر ہم نے بیان کیا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہجرت کو ناپسند فرمایا اور اس دعوت سے ان کی پوری قوم مسلمان ہو گئی۔ قرآن نے اس واقعہ کو رسولوں کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔

دوسری بات یہ یاد رکھیے کہ ہر نقلِ مکانی ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت صرف وہی ہے جب کوئی شخص دعوت کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد اپنے دین و ایمان کے بچانے کے لیے اپنا گھر در اور اپنی قوم کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کرے جہاں اس کو توقع ہو کہ وہ اپنے مشن کے ساتھ زندگی بسر کر سکے گا۔ ایک مہاجر اور ایک پناہ گزیں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ پناہ گزیں کا معاملہ آسان ہے۔ وہ صرف اپنی جان اور ناموس کا تحفظ چاہتا ہے اس وجہ سے اس کو پناہ دینے والوں پر کوئی بڑی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ایک مہاجر جہاں بھی بیٹھتا ہے اپنے مشن کے ساتھ بیٹھتا ہے اس وجہ سے جو اس کی پذیرائی کا شرف حاصل کرتے ہیں ان کو بالواسطہ اس کے مشن کا بھی خیر مقدم کرنا پڑتا ہے اور یہ جانتے ہوئے کرنا پڑتا ہے کہ یہ کسی مرحلہ میں بھی اپنے مشن کے باب میں کسی سمجھوتہ پر راضی ہونے والا نہیں ہے، اگر یہ کسی مداہنت پر راضی ہونے والا ہوتا تو اپنا گھر در کیوں چھوڑتا، پھر تو کچھ نرم گرم معاملہ کر کے وہیں گزر بسر کرتا۔ لیکن جب مشن ہی کے لیے اس نے سب کو چھوڑا ہے تو اس کی خاطر تو وہ سب کو

چھوڑ سکتا ہے، لیکن مشن سے دست بردار ہونے کی توقع تو اس سے نہیں کی جا سکتی۔ اس کو مختصر لفظوں میں یوں سمجھیے کہ مہاجر کی ہجرت اپنے رب کی طرف ہوتی ہے، جیسا کہ سیدنا ابراہیمؑ کا ارشاد ہے: 'اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ' (العنکبوت - ۲۹: ۲۶) (میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں)' اس وجہ سے اس کو صرف اسی کی پروا ہوتی ہے؛ لوگوں کی طرف اس کی ہجرت نہیں ہوتی کہ وہ ان کے رویہ کو کچھ زیادہ اہمیت دے۔

مرحلۂ جہاد:

دعوت اور ہجرت کے مراحل سے گزرنے کے بعد جہاد اور جنگ کا مرحلہ آتا ہے۔ اس وقت ایک طرف تو قوم پر حجت تمام ہو جاتی ہے، اس کے اندر جتنا کھوٹ ہوتا ہے وہ الگ ہو چکا ہوتا ہے، صرف چھاچھ رہ جاتا ہے، دوسری طرف داعی کو یہ ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب تک کی جدوجہد سے دعوت کی راہ میں جان کی بازی کھیلنے والی کتنی سعید روحیں اس کے اردگرد اکٹھی ہوئی ہیں، ان کے اوپر کس حد تک بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور ان کی مجموعی طاقت کے بل پر آگے کیا قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ ایک داعی جب تک صرف وعظ کرتا ہے اس وقت تک تو اس کو صرف زبان کی قوت، کسی مسجد کا منبر اور سامعین کی ایک منتشر بھیڑ کافی ہے، لیکن اگر وہ جہاد کے لیے اٹھنے کا حوصلہ کرتا ہے تو چند اور چیزیں بھی درکار ہیں: ایک آزاد علاقہ جس میں وہ بااختیار ہو؛ ایک آزاد اور منظم جماعت جس پر اس کا اقتدار حاکمانہ ہو اور جس کو وہ اس قسم کی فوجی ٹریننگ دینے کا اہتمام کر سکتا ہو جو اس زمانے میں کارآمد ہو سکے۔ جہاد سے مراد وہ ہڑبونگ نہیں جس کا منصوبہ آج بعض جہادی پمفلٹوں میں پیش کیا جاتا ہے کہ سمع و طاعت کے پابند مریدوں کو حکم دیا جائے گا اور وہ بیلچوں اور لٹھوں سے مسلح ہو کر کسی بنک یا سینما یا ہوٹل پر چڑھ دوڑیں گے۔ ان طالع آزماؤں کو اس طرح کے جہاد کا موقع شاید ایک آدھ بار مل جائے، لیکن اس کے

نتائج اُن طفلانہ حرکتوں کے نتائج سے مختلف نہیں ہو سکتے جو ماضی قریب میں کی گئیں اور آج بھی درسِ آموزی کے لیے کافی ہیں۔ ہم یہاں اپنی ایک تحریر کا اقتباس[1]، شرائطِ جہاد سے متعلق پیش کرتے ہیں تاکہ جو لوگ جہاد کو بچوں کا کھیل سمجھے ہوئے ہیں وہ چاہیں تو اپنی اصلاح کر لیں:

دعوتِ حق کے سلسلہ میں جنگ کی نوبت اس وقت آتی ہے جب تبلیغ اور شہادت علی الناس اور ہجرت کے مرحلے گزر چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی جنگ کے لیے چند ضروری شرطیں ہیں۔ جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہو لیں اہلِ حق کے لیے تلوار اٹھانا اور زمین میں خون ریزی کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر وہ جلد بازی سے ایسا کر بیٹھیں تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب پانا تو الگ رہا الٹا اندیشہ اس بات کا ہے کہ ان سے مواخذہ ہو جائے اور فساد فی الارض کے مجرم قرار پائیں۔

یہ شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا جائے ان پر پہلے پوری طرح حق کی تبلیغ کر دی جائے۔ اس تبلیغ کے بغیر کسی قوم کے خلاف اعلانِ جنگ ناجائز ہے۔ اس کلیہ سے صرف وہ جنگ مستثنیٰ ہے جو مدافعت و حفاظت میں ہو۔ دفاعی جنگ، ہر حالت میں لڑی جا سکتی ہے۔ اس کو افراد بھی لڑ سکتے ہیں اور جماعتیں بھی لڑ سکتی ہیں۔ یہ جنگ تبلیغ کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ جب بھی کسی کے جان و مال اور عزت پر کوئی حملہ ہو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی حفاظت میں جو قوت بھی اس کے پاس بر وقت بہم ہو اس کو استعمال کرے۔ اس راہ میں اگر وہ مارا جائے گا تو اس کو شہادت حاصل ہوگی، اور اگر حملہ آور حریف مارا جائے گا تو اس پر دوہرا گناہ ہوگا۔ ایک اس بات کا کہ اس نے

---

[1] دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار: باب ۱۴

اپنی جان ایک معصیت اور حق تلفی کی راہ میں ہلاک کی، دوسرا اس بات کا کہ اس نے ایک صاحبِ حق کی تلوار خون سے آلودہ کرائی۔ باقی رہی جارحانہ جنگ تو وہ اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک مقدم الذکر شرطِ تبلیغ پوری نہ ہولے۔ لیکن اس تبلیغ کی دو صورتیں ہیں اور ان دونوں صورتوں میں جنگ کے احکام کی نوعیت کچھ مختلف ہو جاتی ہے :

(ل) ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ تبلیغ رسول کے ذریعے سے ہو۔ رسول تبلیغ اور اتمامِ حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے سے اتمامِ حجت کی تمام شرطیں کمال درجہ پوری ہو جاتی ہیں۔ اس عالمِ اسباب میں عقلِ انسانی کو مطمئن کرنے کے لیے جو کچھ ممکن ہے وہ بہتر سے بہتر طریق پر ایک رسول پورا کر دیتا ہے اور اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ اس کو تمام اسباب و وسائل سے مسلح کر کے بھیجتا ہے۔ وہ قوم کے اندر کا بہترین شخص ہوتا ہے، اعلیٰ ترین حسب و نسب کے ساتھ اٹھتا ہے، وہ نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی پاکیزہ ترین اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے، جھوٹ، بہتان، مکاری، بد معاملگی، ادعائے برتری اور خواہشِ تفوق کی آلودگیوں سے اس کا دامن بالکل پاک ہوتا ہے اور اس کی ان خوبیوں کی شہادت جس طرح اس کے دوست دیتے ہیں اسی طرح اس کے دشمنوں کو بھی اس کے ان فضائل سے انکار کی مجال نہیں ہوتی۔ وہ بہترین، عام فہم زبان میں اپنی دعوت پیش کرتا ہے اور اس دعوت کو قوم کے بچہ بچہ تک پہنچا دینے کے لیے اپنے رات دن ایک کر دیتا ہے۔ اس کی تعلیم عقلی استدلال کے اعتبار سے اتنی محکم اور مضبوط ہوتی ہے کہ مخالفوں سے اس کا جواب بن نہیں آتا، اس کے فیضِ تعلیم و صحبت سے لوگوں کی زندگیاں یکسر بدل جاتی ہیں۔ ظالم اور مفسد حق شناس اور عدل پسند ہو جاتے ہیں، ڈاکو اور راہزن نیکوکار اور امن پسند بن جاتے ہیں، زانی اور بدمعاش، عفیف اور پاک دامن بن جاتے ہیں، شرابی اور جواری، پاکیزہ اخلاق اور خدا ترس ہو جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے پہلے اس کو خود کر کے دکھاتا ہے، اور جس قانون و نظام کا داعی ہوتا ہے

اس کا سب سے زیادہ پابند و مطیع وہ خود ہوتا ہے۔ وہ اپنی دعوت کی حقیقت کا اپنے ساتھیوں کی زندگی میں بھی مظاہرہ کراتا ہے۔ وہ لوگوں کے مطالبہ پر معجزے بھی دکھاتا ہے۔ ان تمام وجوہ سے ایک رسول کی تبلیغ اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہے اور جب کسی قوم پر رسول کے ذریعہ سے اتمام حجت ہو چکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بعد کسی قوم کے منکرینِ حق کو جینے کی مہلت نہیں دیا کرتا، بلکہ لازمی طور پر دو باتوں میں سے کوئی نہ کوئی بات ہو کے رہتی ہے۔ اگر حق کو قبول کرنے والے تعداد میں تھوڑے ہوتے ہیں اور قوم کا بڑا حصہ منکر و مخالف رہ جاتا ہے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو الگ کر لیتا ہے اور منکرین و مخالفین کو کوئی ارضی و سماوی عذاب بھیج کر فنا کر دیتا ہے۔ حضرت نوح، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ وغیرہ کی قوموں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اور اگر منکرین کی طرح مؤمنین کی تعداد بھی معتدبہ اور معقول ہوتی ہے تو اس صورت میں اہلِ ایمان کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ منکرین کے خلاف اعلانِ جنگ کریں اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک یہ منکرین توبہ کر کے خدا کے دین کو قبول نہ کریں، یا ان کی نجاست سے خدا کی زمین پاک نہ ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتمامِ حجت کے بعد بنی اسماعیل کے خلاف اسی قسم کی جنگ کے اعلان کا حکم دیا گیا۔

یہ قانون جس اصل پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے رسول اس کے قانونِ مکافات کے مظہر ہوتے ہیں وہ زمین میں خدا کی عدالت بن کر آتے ہیں اور ان کی بعثت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حق و باطل میں فیصلہ ہو جائے، اہلِ حق کامیاب و فائز المرام ہوں اور اہلِ باطل ناکام و نامراد ہوں۔ اور چونکہ اس طرح کی جزا و سزا کے لیے ضروری ہے کہ سزا پانے والوں پر خدا کی حجت پوری طرح تمام کر دی جائے اس وجہ سے رسول اتمام حجت کے تمام شرائط کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں۔ یہ شرطیں جب پوری ہو جاتی ہیں تو خدا کا قانون ان لوگوں کو جینے کی مہلت نہیں دیتا جو نری ہٹ دھرمی کی وجہ سے حق کا انکار کرتے ہیں اور زمین میں

فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سزا چونکہ اس اتمام حجت کے بعد دی جاتی ہے جس کے بعد اس دنیا میں اتمام حجت کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہ جاتا اس وجہ سے اس کو جبر و اکراہ نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ یہ عدل و انصاف کا عین مقتضیٰ ہے۔ رسولوں کے ذریعہ سے اتمام حجت ہو چکنے کے بعد بھی جو لوگ اللہ کے دین کو قبول نہیں کرتے اور ان کے لیے اگر کوئی اور چیز باقی رہ جاتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ غیب کے پردے اٹھا دیے جائیں اور ان کو تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا جائے، لیکن اس طرح کا کشف حجاب اللہ تعالیٰ کی اس سنّت کے خلاف ہے جو اس دنیا میں جاری ہے۔ اس دنیا میں ہم سے ایمان و اسلام کا مطالبہ عقل و استدلال کی بنا پر کیا گیا ہے، نہ کہ مشاہدہ اور معائنہ کی بنا پر۔ اس وجہ سے عقل و استدلال کے لیے جو کچھ مطلوب ہے، جب رسولوں کے واسطہ سے وہ مل چکتا ہے تو اس کے بعد مہلت ملنے کے کوئی معنی نہیں اور اس کے بعد سزا دینے میں جبر کا بھی کوئی پہلو نہیں ہے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ یہ تبلیغ صالحین کے ذریعہ سے ہو۔ صالحین کے ذریعہ سے اس درجہ کا اتمام حجت ممکن نہیں ہے جس درجہ کا اتمام حجت رسولوں کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ نہ یہ ان اسباب و وسائل ہی سے پوری طرح بہرہ مند ہوتے جو رسولوں کے پاس ہوتے ہیں، اور نہ ان کی ذہنی اور قلبی حالتیں ہی وہ ہو سکتی ہیں جو اللہ کے رسولوں کی خصوصیات میں سے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کا شبہات اور بدگمانیوں سے اس درجہ بالاتر ہونا بھی ناممکن ہے جس طرح اللہ کے یہ معصوم رسول ان چیزوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ منکرین حق کے خلاف جو جنگ کرتے ہیں اس کی غایت صرف عدل اور امن کا قیام ہے۔ ان کو صرف یہ حق حاصل ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو قبول نہ کریں ان سے جنگ کر کے ان کے ہاتھوں سے اس سیاسی طاقت کو چھین لیں جو ان کی بیماریوں کو دوسرے بندگانِ خدا تک متعدی کر سکتی ہے اور جتنے سے ان کا یہ مقصد پورا ہو جائے اسی حد پر ان کو رک

جانا چاہیے۔ اس حد سے آگے بڑھنے کی ان کو اجازت نہیں ہے۔ اگر اس حدِ متعین سے ایک قدم بھی وہ تجاوز کر جائیں تو اس پر خدا کے ہاں وہ بازپرس کے مستحق ہوں گے۔ اسی طرح کی جنگیں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ کے زمانوں میں ہوئیں۔ صحابہؓ اپنی مخالف قوموں کے سامنے تین متبادل چیزیں پیش کیا کرتے تھے: ایک یہ کہ اسلام لاؤ اور اسلام لا کر ہر چیز میں ہمارے برابر کے شریک و سہیم بن جاؤ، دوسری یہ کہ اسلامی حکومت کی رعایا بن جاؤ اور ایک متعین ٹیکس ادا کر کے اپنے پرسنل لا کے سوا تمام امور میں ہمارے نظم کی اطاعت کرو، تیسری یہ کہ ہمارے اعلانِ جنگ کو قبول کرو۔ اس صورت میں اگرچہ یہ گمان ہوتا ہے کہ صحابہؓ کی یہ تبلیغ نہایت اجمالی تھی اور وہ اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ دینِ حق کو لوگوں کے سامنے پیش نہیں کرتے تھے جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا یا جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ اس کو اچھی طرح دل نشین کرنے کے لیے پیش کرنا ضروری ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ صحابہؓ کے زمانہ میں ایک نظامِ حق عملاً قائم ہو چکا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ دعوت میں موجود نہیں تھا اس وجہ سے صحابہؓ اسلام کی تفہیم کے لیے کسی تفصیلی تبلیغ سے مستغنی تھے۔ ان کا قائم شدہ نظامِ حق خود اس حقیقت کے اظہار کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور وہ بندگانِ خدا سے ان کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس عملی نظام کی وجہ سے ہر حقیقت ان کے زمانہ میں نمایاں اور ہر بات واضح تھی۔ عقیدہ ہو یا عمل، معاشرت ہو یا سیاست، ہر چیز ایک مکمل حیاتِ اجتماعی کے پیکر میں دنیا کی نگاہوں کے سامنے موجود تھی اور ہر شخص اس کو آنکھوں سے دیکھ کر یہ معلوم کر سکتا تھا کہ اسلام کا ظاہر و باطن کیا ہے اور وہ کن اعتبارات سے دنیا کے تمام نظاموں پر فوقیت رکھتا ہے اور کیوں اسی کو حق حاصل ہے کہ وہ باقی رہے اور اس کے سوا دنیا کے سارے نظام مٹ جائیں۔ اس طرح کا نظام جب بھی دنیا میں قائم و موجود ہو تو وہ اہلِ حق کو تفصیلی دعوت کی ذمہ داریوں

سے سبکدوش کر دے گا اور مجرد اس کے قیام کی وجہ سے اہلِ حق کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ لوگوں سے اس کی اطاعت کا مطالبہ کریں اور اگر لوگ اس مطالبہ سے انکار کریں تو وہ ان سے جنگ کر کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے پر مجبور کریں۔ اسلام عدم اتمام حجت کی صورت میں جو غیر رسل کی دعوت میں متصور ہے، لوگوں کے اس انفرادی حق کو تو تسلیم کرتا ہے کہ وہ جس عقیدہ پر چاہیں قائم رہیں، لیکن وہ کسی گروہ کے لیے یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کسی غیر عادلانہ نظامِ حیات کو لوگوں پر بجبر مسلط کرے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ یہ جنگ صالحین کے ذریعہ سے لڑی جائے۔ کیونکہ اسلامی جہاد دنیا کو فساد سے پاک کرنے کے لیے ہے، اس وجہ سے ان لوگوں کا جہاد کے لیے اٹھنا کوئی معنی نہیں رکھتا جو خود فساد سے آلودہ ہوں۔ یہ کام صرف انہی لوگوں کے کرنے کا ہے اور وہی لوگ اس کو کر سکتے ہیں جو سو فی صد اس مقصد پر ایمان رکھتے ہوں جس کے لیے اللہ تعالٰے نے جہاد کا حکم دیا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ تلوار اٹھائیں اور ان ہی لوگوں کی جنگ جہاد فی سبیل اللہ کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے۔ یہ لوگ اگر اس راہ میں مارے جائیں تو شہید ہوتے ہیں، اور اگر زندہ رہتے ہیں تو غازی اور مجاہد فی سبیل اللہ کے لقب کے مستحق ہیں جو لوگ اس حق و عدل پر ایمان نہ رکھتے ہوں، جس کے قیام کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا ہے، ان کو اسلام ہرگز یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی ایک متنفس کا بھی خون بہائیں اور اگر وہ بہائیں گے تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہوگا اور اس پر ان سے مواخذہ ہوگا۔ اسلامی فوج کرایہ کے آدمیوں سے نہیں بنتی، بلکہ وہ ایسے لوگوں سے مرکب ہوتی ہے جو اسلام پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اسی کی خاطر لڑتے مرتے ہیں۔ اسلامی نظام کی یہ عین فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ صرف اپنے معتقدین ہی کے ذریعہ سے برپا ہو اور وہی لوگ اس کے برپا کرنے میں ساعی ہوں جو یہ سعی محض رضائے الٰہی کے حصول اور اقامتِ حق کی خاطر کریں، نہ کہ کسی دنیوی مفاد کی خاطر۔ اگر ان کی سعی میں حصولِ رضائے الٰہی اور اقامتِ حق کے

پاک جذبہ کے سوا کوئی اور جذبہ شامل ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ ان کی اس سعی کی اسلام کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ جو خون بھی اس سلسلہ میں انہوں نے بہایا ہے اس کا وبال ان کی گردن پر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ رسولوں نے جہاد کے اعلان سے پہلے اس فرض کے لیے صالحین کی جماعت بنائی، کرایہ کے آدمیوں کی کوئی فوج نہیں مرتب کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے سلسلہ میں بعض ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ ایسے لوگوں نے مسلمانوں کی حمایت میں لڑنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں جو اسلام پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور محض قومی عصبیت کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے ان کی پیش کش قبول نہیں فرمائی اور صاف فرمادیا کہ میں اس کام میں ان لوگوں کی مدد سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو اس مقصد پر ایمان نہ رکھتے ہوں جس مقصد کے لیے یہ لڑائی لڑی جارہی ہے۔ حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام نے جو غزوات کیے وہ تمام تر مومنین صالحین کے ذریعہ سے کیے۔

یہی بات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے کہ ان کے زمانوں میں جتنے بھی غزوات ہوئے، سب انہی لوگوں کے ذریعہ ہوئے جو اعتقاداً اور عملاً اس چیز کو تسلیم کرتے تھے جس کو برپا کرنے کے لیے انہوں نے تلوار اٹھائی تھی اور باوجودیکہ ان کے اثرات بہت وسیع تھے اور وہ چاہتے تو آسانی سے کرایہ کی فوج جمع کر لیتے، لیکن نہ صرف یہ کہ انہوں نے کرایہ کی فوج نہیں بھرتی کی، بلکہ خود اپنی بھی کوئی تنخواہ دار مستقل فوج نہیں قائم کی۔ جب جنگ کی حالت پیش آجاتی تو ہر شخص اپنا توشہ اور اپنی سواری لے کر نکلتا اور محض اقامتِ دین کی خاطر جہاد کرتا۔ اور احتیاط اور تقویٰ کی شان یہ تھی کہ عین اس وقت جب کہ دشمن سے ردّ و بدل ہو رہی ہوتی اگر کسی کے دل میں یہ خطرہ بھی گزر جاتا کہ اس وقت حصولِ رضائے الٰہی کے جذبہ کے سوا کسی اور نفسانی جذبہ سے وہ مغلوب ہو گیا ہے تو فوراً ہی اپنی کھنچی ہوئی

تلوار میان میں کرلیتا کہ مبادا یہ کسی انسان کا خون محض نفس کو خوش کرنے کے لیے بہا دے۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ یہ جنگ ایک با اختیار اور با اقتدار امیر کی قیادت و امارت میں لڑی جائے۔ با اختیار و با اقتدار امیر سے مطلب یہ ہے کہ اس کا اقتدار اپنی جماعت پر بزور و قوت قائم ہو۔ وہ لوگوں پر شریعت کے احکام نافذ کر کے اس کی اطاعت پر لوگوں کو مجبور کر سکتا ہو اور خدا کے سوا کسی اور بالاتر اقتدار کا وہ محکوم نہ ہو۔ اس شرط کا سب سے زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ انبیائے کرام میں سے کسی نے بھی اس وقت جہاد کا اعلان نہیں کیا جب تک انہوں نے ہجرت کر کے اپنی جماعت کو کسی آزاد علاقہ میں منظم نہیں کر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے بھی اس چیز کا ثبوت ملتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے۔ بعد کے زمانوں میں بھی جن لوگوں نے انبیاء کے طریقہ پر یہ فرض انجام دینے کی کوشش کی، مثلاً حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید، انہوں نے بھی اس امر کو پیش نظر رکھا اور ایک آزاد علاقہ میں پہنچ کر پہلے اپنی ایک با اختیار امارت بھی قائم کی اور اپنی جماعت کی تنظیم کر کے اس کے اندر شریعت کے تمام احکام و قوانین کا نفاذ بھی کیا۔

اس شرط کی دو وجہیں ہیں:

(ل) پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی باطل نظام کے اختلال و انتشار کو بھی اس وقت تک پسند نہیں کرتا جب تک اس بات کا امکان نہ ہو کہ جو لوگ اس باطل نظام کو درہم برہم

---

1 اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا بعض حالات میں اسلامی جنگ میں حصہ لے سکتی ہے لیکن اس کے شرائط و حالات بالکل خاص ہیں یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی ریاست' میں کی ہے۔

کر رہے ہیں وہ اس کی جگہ پر کوئی نظام حق قائم بھی کر سکیں گے۔ انارکی اور بے نظمی کی حالت ایک غیر فطری حالت ہے، بلکہ انسانی فطرت سے یہ اس قدر بعید ہے کہ ایک غیر عادلانہ نظام بھی اس کے مقابل میں قابل ترجیح ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی جماعت کو جنگ چھیڑنے کا اختیار نہیں دیا ہے جو بالکل مبہم اور مجہول ہو، جس کی قوت و استطاعت غیر معلوم اور مشتبہ ہو، جس پر کسی ایک با اختیار امیر کا اقتدار قائم نہ ہو، جس کی اطاعت و وفاداری کا امتحان نہ ہوا ہو، جس کے افراد منتشر اور پراگندہ ہوں، جو کسی نظام کو درہم برہم تو کر سکتے ہوں، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت انہوں نے بہم نہ پہنچایا ہو کہ وہ کسی انتشار کو مجتمع بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اعتماد صرف ایک ایسی جماعت ہی پر کیا جا سکتا ہے جس نے بالفعل ایک سیاسی جماعت کی صورت اختیار کر لی ہو اور جو اپنے دائرہ کے اندر ایک ایسا ضبط و نظم رکھتی ہو کہ اس پر "الجماعت" کا اطلاق ہو سکے۔ اس حیثیت کے حاصل ہونے سے پہلے کسی جماعت کو یہ حق تو حاصل ہے کہ وہ "الجماعت" بننے کے لیے جدوجہد کرے اور اس کی یہ جدوجہد جہاد ہی کے حکم میں ہوگی، لیکن اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ عملاً جہاد بالسیف اور قتال کے لیے اقدام شروع کر دے۔

(ب) دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی جنگ کرنے والی جماعت کو انسانوں کے جان و مال پر جو اختیار حاصل ہو جایا کرتا ہے وہ ایسا غیر معمولی اور اہم ہے کہ کوئی ایسی جماعت اس کو سنبھال ہی نہیں سکتی جس کے لیڈر کا اقتدار اس کے اوپر محض اخلاقی قسم کا ہو۔ اخلاقی اقتدار اس امر کی کافی ضمانت نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے فساد فی الارض کو روک سکے۔ اس وجہ سے مجرد اخلاقی اقتدار کے اعتماد پر کسی اسلامی لیڈر کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دے دے، ورنہ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ جب ایک مرتبہ ان کی تلوار چمک جائے گی تو وہ حلال و حرام کے حدود کی پابند نہیں رہے گی اور ان کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہو جائے گا جس کے مٹانے ہی کے

لیے اس نے تلوار اٹھائی ہے۔ عام انقلابی جماعتیں، جو مجرد ایک انقلاب برپا کرنا چاہتی ہیں اور جن کا مطمح نظر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ وہ قائم شدہ نظام کو درہم برہم کر کے برسرِ اقتدار پارٹی کے اقتدار کو مٹائیں اور اس کی جگہ اپنا اقتدار جمائیں، اس قسم کی بازیاں کھیلتی ہیں اور کھیل سکتی ہیں۔ ان کے نزدیک، نہ کسی نظم کا اختلال کوئی حادثہ ہے، نہ کسی ظلم کا ارتکاب کوئی معصیت، اس وجہ سے ان کے لیے سب کچھ مباح ہے۔ لیکن ایک عادل اور حق پسند جماعت کے لیڈروں کو لازماً یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ جس نظم سے وہ خدا کے بندوں کو محروم کر رہے ہیں اس سے بہتر نظم ان کے واسطے مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں اور جس ظلم کے مٹانے کے وہ درپے ہیں اس قسم کے مظالم سے اپنے آدمیوں کو بھی روکنے پر وہ پوری طرح قادر ہیں یا نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ محض اتفاقات کے اعتماد پر وہ لوگوں کے جان و مال کے ساتھ بازیاں کھیلیں اور جس فساد کو مٹانے کے لیے اٹھے ہیں اس سے بڑا فساد خود برپا کرادیں۔

(۴) چوتھی شرط حصولِ قوت ہے۔ لیکن صالحین کی جماعت کو اس کے لیے کوئی علیحدہ اہتمام کرنا نہیں پڑتا۔ اوپر جو تین شرطیں بیان ہوئی ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک پورے کر دینے سے ضروری قوت خود بخود بہم ہو جاتی ہے۔ ایک صحیح دعوت ہر قوت و استعداد کے آدمیوں کو اپنے اردگرد مجتمع کر لیتی ہے اور ان کے واسطے سے سرمایہ بھی بہم ہو جاتا ہے اور ضروری وسائلِ کار یا ان کے پیدا کرنے کی قابلیتیں بھی فراہم ہو جاتی ہیں۔ پھر جب یہ جماعت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ایک آزاد ماحول میں اپنے آپ کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے ایک با اقتدار امیر کی اطاعت پر جمع کر لیتے ہیں تو ان کی اخلاقی اور معنوی قوت بھی دو چند ہو جاتی ہے اور مادی وسائل کے فراہم کرنے اور پیدا کرنے کے امکانات بھی وسیع تر ہو جاتے ہیں۔ پس جہاں تک حصولِ طاقت کی سعی کا تعلق ہے وہ فی الحقیقت ان شرائط کی تکمیل کے اندر ہی مضمر ہے۔ اس سے علیحدہ اس کے لیے کسی خاص مہم کی ضرورت

پیش نہیں آتی۔ تاہم جارحانہ جنگ کے لیے قوت کی فراہمی بھی ایک ضروری شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی جماعت جنگ کا اعلان کر دے تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی مجرم ہو گی۔

ان تمام شرائط کی نوعیت پر غور کرنے کے بعد یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ کسی دعوتِ حق کے سلسلہ میں جنگ کا مرحلہ شہادت علی الناس اور ہجرت کے مراحل کے بعد کیوں آتا ہے۔ درحقیقت ان دونوں مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی وہ لوگ متعین ہو کر سامنے آتے ہیں جن سے اسلام میں جنگ جائز ہے اور ان مراحل سے گزر چکنے کے بعد ہی وہ جماعت بھی صحیح معنوں میں وجود میں آتی ہے جس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ تلوار کے زور سے امن و عدل کرے۔ جو لوگ انبیائے کرام کی اس ترتیبِ کار سے واقف نہیں ہیں اور صرف عام انقلابی جماعتوں کے طریقِ کار ہی سے متاثر ہیں ان کو ان تمام مراحل کے فوائد اور نتائج پر غور کرنا چاہیے۔

آدمی کا تعلّق ریاست سے

انسان کو جو برکتیں معاشرہ سے حاصل ہوتی ہیں ان میں سے ایک بہت بڑی برکت یہ ہے کہ معاشرہ اپنی اجتماعی تنظیم کی قوت اور اس کے زور واثر سے اس کو باہمی تعدّیوں سے بھی محفوظ رکھتا ہے اور باہر سے کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو اس سے بھی اس کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ چیز انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ تحفظ اس کو حاصل نہ ہو تو وہ ہر وقت اندرونی اور بیرونی خطروں میں گھرا رہے گا جس سے اس کی معاش و معیشت اور تعمیر و تمدّن کی رہنما اعلیٰ صلاحیتیں دب دبا کر ختم ہو جائیں گی جو اس کے اندر ودیعت ہیں۔

انسان نے اپنی اس فطری ضرورت کے تقاضوں سے، شروع ہی سے، جب سے اس کی تاریخ کا کچھ سراغ ملتا ہے، جس طرح ایک اجتماعیت پسند حیوان (SOCIAL ANIMAL) کی زندگی پسند کی ہے اسی طرح ایک سیاسی مخلوق (POLITICAL BEING) کی زندگی کا بھی پورا التزام رکھا ہے۔ اس کی تاریخ کا کوئی دور بھی ایسا نظر نہیں آتا ہے جب وہ حکومت سے بالکل بے نیاز رہا ہو، عام اس سے کہ یہ حکومت پدرسرانہ قسم کی رہی ہے یا قبائلی نوعیت کی، آمرانہ طرز کی رہی ہے یا رضاکارانہ مزاج کی؛ بہر حال کسی نہ کسی قسم کا سیاسی نظام اس نے ضرور اختیار

کیا ہے، اس کو اپنے قیام و بقا اور تعمیر و ترقی کے لیے ضروری و لازمی جانا ہے اور اس کے فوائد سے بہرہ مند ہوتے رہنے کے لیے جن قربانیوں کا حالات نے مطالبہ کیا ہے وہ بھی اس نے بڑی فیاضی سے پیش کی ہیں۔

اس وقت ہم حکومت کے فلسفہ اور اس کے نظام پر کوئی گفتگو کرنی نہیں چاہتے، خاص اس موضوع پر 'اسلامی ریاست' کے عنوان سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ یہاں ہمارے سامنے صرف یہ سوال ہے کہ ایک مسلم کی حیثیت سے ہمارا تعلق اس ریاست سے کس نوعیت کا ہونا چاہیے جس کے ہم شہری ہیں؟

حکومت کی مختلف قسمیں اور ان کے احکام:

اس سوال کے صحیح جواب کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیجیے کہ اس دور میں کس نوعیت کی حکومتوں سے آپ کو سابقہ پیش آسکتا ہے اس کے بعد یہ معین کرنے میں آسانی ہوگی کہ ایک مسلم کی حیثیت سے ان میں سے کس کے ساتھ، آپ کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

ایک شکل تو یہ ہوسکتی ہے کہ حکومت غیر مسلموں کی ہو، آئین اور قانون غیر اسلامی ہو، لیکن پرسنل لا کے حد تک، ایک اقلیت کی حیثیت سے آپ کے حقوق محفوظ ہوں، دین کی تبلیغ و دعوت کی اجازت ہو اور اگر کوئی شخص آپ کی دعوت سے متاثر ہوکر اس کو قبول کرلے تو اس کو ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنایا جاتا ہو۔

دوسری شکل یہ ہے کہ حکومت غیر مسلموں کی یا نام نہاد مسلمانوں کی ہو، لیکن اس میں ایک خاص غیر اسلامی نظریۂ حیات کے سوا کسی اور نظریہ یا عقیدہ کی دعوت و اشاعت ممنوع ہو اور اگر کوئی اس کی جرأت کرے تو اس کو مستحق سزا سمجھا جاتا ہو۔

تیسری شکل یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی ہو، لیکن آئین و قانون جاہلیت اور

اسلام، دونوں کا ملغوبہ ہو، زبانوں پر نعرہ اسلام کا ہو، لیکن عمل میں ایک قدم اسلام کی طرف اٹھتا ہو تو دوسرا قدم جاہلیت کی طرف بھی بڑھتا ہو۔

چوتھی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ حکومت ظاہراً اور باطناً، دونوں میں اسلامی ہو آئین و قانون کتاب و سنت پر مبنی ہو، حکومت کے چلانے والے قولاً و عملاً مسلمان ہوں اگرچہ اشخاص اور نظام، دونوں میں بعض اعتبارات سے خامیاں بھی ہوں۔

ان چاروں قسموں کی حکومتوں کے معاملہ میں آپ کا رویہ اگر کلیتہً نہیں تو فی الجملہ الگ الگ ہوگا۔ اب ہم اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہلی قسم کی حکومت:

پہلی قسم کی حکومت ایک غیر مسلم حکومت ہونے کے پہلو سے اگرچہ ایک مسلمان کے عقیدہ اور مسلک سے متصادم ہے اس وجہ سے جو مسلمان اس کے اقتدار کے زیر اثر زندگی بسر کریں گے ان کے لیے اپنے عقیدہ و مسلک اور اپنی تہذیب و روایات کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھنا کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ صرف مذہب اور روایات ہی کے پہلو سے بھی یہ صورت کسی طرح ان کے لیے سازگار نہیں ہے۔ یہ چیز جب بھی گوارا کی جائے گی بدرجۂ مجبوری ہی گوارا کی جائے گی۔ بس اتنی بات غنیمت ہے کہ سیکولر ہونے کے سبب سے توقع ہے کہ کم از کم ذاتی عقیدہ و مذہب کے معاملہ میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ اگر یہ چیز حاصل ہو تو ایک مسلمان ایسی غیر مسلم حکومت کا وفادار شہری رہ سکتا ہے۔ اس کی وفاداری کی مثال ویسی ہی ہوگی جس کا ذکر ہم پیچھے ماں باپ کے حقوق والے باب میں کر چکے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص خود مسلمان ہو، لیکن اس کے ماں باپ غیر مسلم ہوں تو وہ دنیوی معاملات کے حد تک ان کا وفادار رہے گا البتہ اپنے دین کے معاملہ میں ان کی مداخلت گوارا نہیں کرے گا۔

اس زمانے کی ترقی یافتہ جمہوری حکومتوں میں بالعموم آدمی کو اپنے دین وعقیدہ کی تبلیغ و دعوت کی بھی آزادی ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص اس کی دعوت قبول کر کے دین وعقیدہ میں اس کا شریک بن جاتا ہے تو اس کی راہ میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جاتی۔ اگر یہ آزادی کسی ریاست میں حاصل ہے تو ایک مسلمان اس کے اندر اپنا دینی فریضۂ شہادتِ حق ادا کرسکتا ہے اور اس طرح کے ماحول میں اس کے اوپر دین کی اس سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

یہ بات یہاں یاد رکھیے کہ ایک مسلمان سے اسلام کا اصل مطالبہ صرف یہی ہے کہ وہ جہاں رہے حق کی شہادت دیتا رہے۔ اگر یہ کام وہ کر رہا ہے تو وہ اپنا اصل ملی فریضہ جو اس پر وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ (البقرۃ - ۲:۱۴۳) (اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے) کی رو سے عائد ہوتا ہے، ادا کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ اسلام نے اس کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔

اس زمانے میں دین سے بعض بے خبر مدّعیوں نے اسلامی حکومت کے قیام کے جوش میں منتشر افراد اور ایک منظم معاشرہ کی ذمہ داریوں میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھا، متفرق افراد سے انہوں نے اسلامی حکومت قائم کرنے کا عہد لینا شروع کر دیا حالانکہ متفرق افراد اپنے دائرہ میں صرف دعوتِ دین اور شہادتِ حق کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اگر یہ کام وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق کر رہے ہیں تو وہ عند اللہ اس امر کے لیے مسئول نہیں ہوں گے کہ انہوں نے حکومتِ اسلامیہ کا نعرہ لگانے والوں کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ اسلامی حکومت قائم کرنے کی ذمہ داری اس منظم معاشرہ پر عائد ہوتی ہے جو کسی خطہ میں یہ پوزیشن حاصل کر چکا ہو کہ اس میں اپنی صواب دید کے مطابق قانون نافذ کر سکے۔ سورۂ

حج میں ایک منظم اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ	یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ	اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ	گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم
نَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰهِ	دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور
عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝	انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار
(الحج - ۲۲:۴۱)	میں ہے۔

مسلمانوں کے سامنے یہ پروگرام اس وقت رکھا گیا ہے جب فتح مکہ کی منزل سامنے نظر آنے لگی ہے۔ اس سے پہلے مکی زندگی میں ان کو جن مراحل سے گزرنا پڑا ان کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ دونوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے، لیکن ہمارے اس دور کے غازیوں کو اس سوال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو جن لوگوں کو بے وقوف بنانا ہے اُن کے لیے اس خشک اور صبر آزما پروگرام میں کوئی خاص کشش نہیں ہے۔ وہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ پہلا ہی قدم یا تو بیعت رضواں سے اٹھاتے ہیں یا فتح مکہ سے۔

جن لوگوں کو اجتماعیات کا کچھ تجربہ ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ جو جماعت قوم کی اجتماعی اصلاح کے منصوبہ کے ساتھ اٹھے اس کی کامیابی کے لیے سب سے مقدم شے یہ ہے کہ اس کا عملی پروگرام اس کی جماعتی قوت و صلاحیت کے بالکل ہم وزن ہو۔ جس کی قوت صرف سیر بھر بوجھ اٹھا سکتی ہو اس کے اوپر من بھر بوجھ لاد دینا پرلے سرے کی حماقت ہے۔ جو لوگ دین اور دیانت، دونوں سے عاری ہوتے ہیں ممکن ہے اس طرح وہ اپنے بعض ذاتی مقاصد پورے کر لیتے ہوں، لیکن اس قسم کے اصحاب الاغراض کے ہاتھوں اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔

دوسری قسم کی حکومت :

دوسری قسم کی حکومت، خواہ غیر مسلموں کی ہو یا نام نہاد مسلمانوں کی، ایک مسلمان کے دین و ایمان کے لیے اس عہد کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس نظام کے بانیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ان کے نظام کے قیام و استحکام کے لیے ہر قسم کے دین کی بیخ کنی لازمی ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ تجزیہ بالکل مبنی بر حقیقت ہے۔ اشتراکیت کے ساتھ دہریت کے سوا اور کسی دین کا جوڑ نہیں ہے۔ اب اگرچہ یہ نمائش کرنے کی سعی کی جا رہی ہے کہ دنیا کی دوسری حکومتوں کی طرح ان کی حکومت میں بھی ہر شخص کو اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت ہے، لیکن وہ جو ذہنی تطہیر (BRAIN WASHING) کرتے ہیں اس کے بعد آدمی کے اندر اتنی صلاحیت باقی نہیں رہ جاتی کہ رسوم کی ادائیگی اس کے لیے کچھ نافع ہو سکے۔

سب سے زیادہ غم اور افسوس یہ ہے کہ جن نام نہاد مسلمانوں نے اس نئے دین کو اختیار کر لیا ہے ان کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دین کے اس کے اصل بانیوں سے بھی زیادہ وفادار ہیں۔ انھوں نے اس کی خاطر خود اپنے بھائیوں پر جو ظلم ڈھائے ہیں شاید دوسرے اس سے زیادہ ظلم نہ ڈھا سکتے۔ اب ان کے ظلم سے بچنے کی بظاہر واحد راہ یہی باقی رہ گئی ہے کہ آدمی اپنا گھر در چھوڑ کر کسی دوسرے علاقہ کو ہجرت کر جائے، لیکن اس کڑے امتحان سے گزرنے کا کوئی حوصلہ کر بھی لے تو اس زمانے میں اس سے بھی زیادہ مشکل سوال یہ ہے کہ ؏

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلیؔ اب کہاں جائیں

تاہم جو ممالک اب اشتراکیت کے نرغے میں آ چکے ہیں ان کے اندر کے مسلمانوں کے لیے دو ہی راہیں باقی رہ گئی ہیں: یا تو ارتداد کی راہ اختیار کریں یا جہاد اور ہجرت کی۔ پہلی راہ

اختیار کرنے کا مشورہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو نہیں دے سکتا۔ زندگی کتنی ہی عزیز سہی، لیکن ایمان سے زیادہ عزیز نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی مسلمان کے سامنے یہ سوال آجائے کہ وہ ایمان اور زندگی میں سے کس کو اختیار کرے اور کس کو چھوڑے تو اس کی سعادت دارین اس میں ہے کہ وہ زندگی کو قربان کر کے اپنے ایمان کو بچائے۔ رہا ہجرت اور جہاد کا معاملہ تو اس کا تعلق حالات اور مواقع سے ہے۔ اور اس پر غور کرنا، رہنمائی دینا اور اس کے اسباب و وسائل فراہم کرنا اُن مسلمان حکومتوں کا کام ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اشتراکیت کی یلغار سے محفوظ ہیں۔ ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ باہمی تعاون سے اس مسئلہ کا حل سوچیں اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے جرأت کے ساتھ اقدام کریں۔ اب اس میں تغافل کی پالیسی مہلک اور تاخیر خودکشی ہوگی۔ اشتراکیت کے زیر اقتدار پھنسے ہوئے مسلمانوں کا معاملہ اگر اسی پر چھوڑ دیا گیا، اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کی طرف سے ان کو کوئی سہارا ملنے کی توقع نہ ہوئی تو پھر وہ اس ماحول میں یا تو تحلیل ہو جائیں گے یا گھٹ کر فنا ہو جائیں گے اور اس پالیسی کا انجام بالآخر یہ ہوگا کہ بہت جلد وہ علاقے بھی اس سیلاب کی زد میں آجائیں گے جو بظاہر ابھی محفوظ ہیں۔

تیسری قسم کی حکومت:

تیسری قسم کی حکومت کی سب سے نمایاں مثال خود ہمارے ملک کی حکومت ہے۔ اس اعتبار سے تو یہ بسا غنیمت ہے کہ اس کا آغاز اسلام کے نعرہ سے ہوا ہے اور یہ نعرہ ابتدا سے لے کر اب تک برابر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ جتنی پارٹیاں اور جتنے لیڈر اس کی سیاست کے میدان میں اترے ہیں سب نے کسی نہ کسی نوعیت سے اس نعرے کا سہارا ضرور لیا ہے۔ اس کے بغیر کسی نے میدان میں اترنے کا حوصلہ نہیں کیا ہے۔

اس ملک کی تاریخ کا یہ پہلو ان لوگوں کے لیے بہت ہی حوصلہ افزا ہے جو اس کو ایک حقیقی اسلامی ریاست کی شکل میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اس تمنا کے بروئے کار آنے کے لیے ضروری ہے کہ اس راہ میں جو مشکلات حائل ہیں ان کا صحیح صحیح اندازہ کر لیا جائے تاکہ اس کے لیے اس نہج پر کوشش کی جائے جو نتیجہ خیز ہو۔

ہم یہاں چند حقائق کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو اگرچہ بعض لوگوں کو تلخ محسوس ہوں گے، لیکن ان کو اچھی طرح سمجھ نہ لیا گیا تو اندیشہ ہے کہ جس طرح یہ نعرہ اب تک صرف ایک نعرہ ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، وہ اس طرح ممکن ہے کہ کچھ دنوں اور بھی باقی رہے، لیکن بالآخر یہ بالکل بے اثر ہو کر رہ جائے گا۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہماری قوم کی زبان پر اسلام، اسلام کی رٹ تو بہت ہے، لیکن اسلام کا شعور بالکل نہیں ہے۔ اس معاملہ میں عوام اور خواص سب یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کے لیڈر، جو بڑی بلند آہنگی سے اسلام کا نعرہ بھی بلند کرتے رہے ہیں، صاف صاف کہتے ہیں کہ ہم اور ہمارے باپ دادا صدیوں سے اسلام پر چلے آرہے ہیں۔ اب اس طریقہ کے سوا اسلام اور کیا ہے جو اس ملک میں لایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ یہ مسلمان ہیں اس وجہ سے یہ جو کچھ کرتے ہیں وہ آپ سے آپ اسلامی بن جاتا ہے، اس کے اسلامی ہونے کے لیے کسی اور سند کی ضرورت نہیں ہے۔ ؎

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

ان لوگوں کو یہ گھمنڈ بھی ہے کہ انہی کے آباء واجداد کے واسطہ سے اس ملک کے لوگوں کو دین ملا ہے تو ان کے سوا کوئی دوسرا اس بات کا اہل کس طرح ہو سکتا ہے کہ ان کو دین سکھانے کے لیے اٹھے۔

ارباب اقتدار کی طرف سے اسلامائزیشن کے پروگرام نے اس زمانے میں ایک اور غلط فہمی، شدید قسم کی، خاص طور پر ان کے سیاسی حریفوں کے اندر یہ بھی پیدا کردی ہے کہ اسلام، اسلام کا نعرہ محض اپنے اقتدار کے تحفظ اور عوام فریبی کے لیے لگایا جا رہا ہے، اس کے اندر اخلاص اور صداقت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ اس خیال نے اس زمانے میں بہت سے لوگوں کے اندر دین بیزاری کی ایک کیفیت پیدا کردی ہے جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی گئی تھی۔

جہاں تک ملک کے عوام کا تعلق ہے ان کے دینی جوش کے بعض وقتی مظاہروں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ فی الواقع یہ کسی حقیقی دینی محرک ہی کے تحت ظہور میں آتے، بلکہ ان کا صحیح طور پر تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی دین سے زیادہ دوسرے عوامل کا دخل رہا ہے، لیکن ان کو پس پردہ ہی رکھنے میں مصلحت سمجھی گئی۔ اوّل تو عوام کی اکثریت اپنے پیٹ اور تن کے مسائل میں اس طرح الجھی ہوئی ہے کہ اس کو کسی سیاسی یا مذہبی مسئلہ پر غور کرنے یا اس میں حصہ لینے کی سرے سے فرصت ہی نہیں ہے اور اگر کچھ لوگوں کے اندر کچھ مذہبی رمق ہے تو وہ یا تو اپنے فرقہ کے مولویوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں یا اپنے حلقہ کے کسی پیر سے وابستہ ہیں۔ وہ اپنے دینی معاملات میں انہی کی آنکھوں سے دیکھتے اور انہی کے کانوں سے سنتے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ اس سے ہٹ کر کچھ سوچ یا سمجھ سکیں۔

جنہوں نے کچھ تعلیم پائی ہے، عام اس سے کہ یہ تعلیم مذہبی ہے یا جدید دنیوی، ان کا حال بھی یہ ہے کہ ان سے کسی خیر کی امید بظاہر ایک امید موہوم ہی ہے۔ مذہبی تعلیم پانے والوں کے متعلق اگر ہم یہ کہیں تو غالباً بے جا نہ ہو کہ انہوں نے اسلام کی نہیں، بلکہ اپنے فرقہ کے دین کی تعلیم پائی ہے اور اسی کو وہ کفر اور اسلام کی کسوٹی بناتے ہوتے ہیں۔ اس سے الگ ہو کر ان کے لیے کچھ سوچنا ناممکن اور اس کو اختیار کرنا محال ہے۔ ان سے یہ اپیل کرنا کہ وہ اختلافی امور کو چھوڑ کر صرف مشترک امور پر تقریریں کریں اور خطبے دیں

اپیل کرنے والوں کی بے خبری پر دلیل ہے۔ ان کے درمیان اشتراک اگر ہے تو چند اسماء میں ہے ان کے مسمّیٰ ان میں سے ہر ایک کے نزدیک بالکل الگ الگ ہیں۔ توحید، آخرت اور رسالت جیسے بنیادی مسائل میں بھی ایسے ایسے اختلافات پیدا ہوگئے ہیں کہ ممکن نہیں رہا کہ مختلف فرقوں کے لوگ کسی ایک مسجد میں، ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ سکیں۔

ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ اس نے تعلیم کا مقصد سرکار کی نوکری کرنا سمجھ رکھا ہے اور وہ یہ کام نہایت وفاداری کے ساتھ کر رہی ہے۔ یہ نظام تعلیم انگریزوں نے اس مقصد سے قائم کیا تھا اور اب تک یہ، بلا کسی بنیادی ترمیم و اصلاح کے، اس مقصد کے لیے قائم ہے اس وجہ سے ان لوگوں کو ملامت نہیں کی جاسکتی جو اس مقصد کو وفاداری کے ساتھ پورا کر رہے ہیں۔ جب ان کو ایک آزاد قوم کی ذمہ داریوں، ایک امتِ مسلمہ کے فرائض اور شہداء اللہ علی الناس اور خلفاء اللہ فی الارض کا کوئی تصور سرے سے دیا ہی نہیں گیا تو آخر ان کے تقاضوں اور مطالبوں کا شعور ان کے اندر کہاں سے ابھرتا؟

اس گروہ کے اندر جو لوگ ذہنی اعتبار سے ذرا اونچے ہوئے اور انہوں نے قوم کی صلاح و فلاح کے کاموں میں کچھ حصہ لیا چونکہ اسلام کے فکر و فلسفہ سے وہ بالکل محروم اور انگریزوں کی تہذیب و تعلیم سے نہایت مرعوب تھے اس وجہ سے انہوں نے یا تو کھلم کھلا ہر شعبۂ زندگی میں انہی کے طور طریقے کی پیروی کی دعوت دی اور اگر یہ جرأت نہ کر سکے، بلکہ کچھ اسلام کی بھی لاج رکھنی چاہی تو ان کی پھیلائی ہوئی ساری ضلالتوں کو اسلام کے نام سے قوم پر لادھا دینے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ اگر یہ کہا جائے کہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہماری قوم ان کے سانچے میں اتنی نہیں ڈھلی تھی جتنی اب ڈھل گئی ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔

اب جو صورتِ حال ہے اس کو پیشِ نظر رکھ کر بے تکلف یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ بہت جلد وہ وقت آرہا ہے جب اقدار اور پیمانے اس طرح تبدیل ہوجائیں گے کہ ہمارے ملک کی اسمبلیوں کے انتخابات میں ہمارے بڑے بڑے علماء اور مشائخ اداکاروں اور

اداکاراؤں سے شکست کھاجائیں گے اور اس قوم میں ایک شخص بھی ان پر ترس کھانے والا نہ ہوگا۔

یہ ہم نے نہایت مختصر لفظوں میں اس معاشرے کی جو تصویر کھینچی ہے اگر آپ بغیر کسی تعصب کے اس پر غور کریں گے تو ان شاء اللہ اس کو بالکل صحیح پائیں گے۔ اب آپ اس ملک کے ایک مسلمان اور فرض شناس شہری کی حیثیت سے غور کیجیے کہ آپ پر اس کو خطرات سے بچانے اور صحیح سمت میں اس کو آگے بڑھانے میں کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اس سوال پر غور کرنے کی دعوت ہم اس وجہ سے دے رہے ہیں کہ بحیثیت ایک مسلمان کے آپ پر یہ فرض ہے کہ آپ اس سوال کا جواب معلوم کریں اور اس پر عمل کریں ورنہ آپ اپنے فرض سے تغافل برتنے والے ٹھہریں گے۔

اس سوال پر غور کرنے کی ذمہ داری ہر شخص پر ہے، خواہ وہ ملک کا ایک عام شہری ہے یا ایک بااقتدار و بااختیار حکمراں۔ بلکہ ایک بااقتدار کے لیے دوسروں کی نسبت زیادہ ضروری ہے کہ وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہزار بار سوچے کہ اس کے اقدام کے نتائج کیا کچھ ہوسکتے ہیں۔ ایک عام آدمی کی استطاعت محدود ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے کسی قول و فعل کے نتائج بھی محدود ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ایک بااقتدار اگر کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اس کے نتائج بہت دور رس ہوسکتے ہیں اگر خدانخواستہ اقدام غلط سمت میں ہے۔

ہمارے معاشرے کے متعلق اگر کوئی شخص یہ رائے قائم کرے کہ یہ اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے بالکل ہموار ہے تو میرے نزدیک اس سے زیادہ غلط رائے کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ اسلام کا نام تو بے شک اس قوم کو بہت محبوب ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کا اسلام ایک دوسرے کے اسلام سے اتنا مختلف ہوگیا ہے کہ ان کو ایک اسلام پر متفق کرنے میں ایک عظیم جدوجہد، بلکہ ایک عظیم جہاد کے مرحلہ سے گزرنا پڑے گا۔ اس جہاد

سے گزرے بغیر اگر زندگی کے بعض گوشوں میں کچھ قوانین شریعت ــــ از قسم حدود و تعزیرات ــــ نافذ کر دیے گئے تو ان کی مثال ان بدقسمت بیجوں کی ہو گی جو کسی شور اور ناہموار زمین میں پھینک دیے گئے ہوں۔ وہ ضائع تو بہرحال ہوں گے، لیکن ان کے ضائع ہونے سے بھی بڑا حادثہ یہ ہو گا کہ اس سے اسلامی شریعت کے متعلق شدید قسم کی غلط فہمی پیدا ہو گی بلکہ آئندہ کے لیے شاید اس کے نفاذ کا راستہ بھی مسدود ہو جائے۔

اس وقت کرنے کا اصلی کام یہ ہے کہ معاشرہ کی فکری ناہمواریوں کو دور کرنے کے لیے اس نصب العین کو سامنے رکھ کر ایک مہم چلائی جائے کہ اس کے اندر ایک امت مسلمہ بننے کا شعور بیدار ہو۔ یہ شعور بیدار کرنے کے لیے بڑی انقلابی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اس کے لیے ملک کے ہر شہری کو یہ بتانا اور سکھانا پڑے گا کہ ہم مسلمان اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے سوا اور کسی چیز کے پابند نہیں ہیں، ہمارے نزدیک حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی یہی ہیں، ان پر پرکھے بغیر کسی چیز کو اختیار کرنا ہمارے لیے جائز نہیں۔ قرآن کے متعلق لوگوں کی یہ عام غلط فہمی دور کرنی پڑے گی کہ یہ محض بطور تبرک تلاوت یا ایصالِ ثواب کی چیز ہے اور اس کے معانی و مطالب سے متعلق جو کچھ تفسیر کی مشہور کتابوں میں ہے بس وہی کافی ہے، اس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی جگہ ذہنوں میں یہ عقیدہ راسخ کرنا پڑے گا کہ قرآن قیامت تک کے لیے، ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی کرنے والا صحیفہ ہے اور اس کے اندر حکمت و فلسفہ کے جو خزانے بند ہیں وہ کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ اس طرح لوگوں کو فرقہ وارانہ اور گروہی تعصبات سے آزاد کرنے کے لیے ان کو یہ سکھانا پڑے گا کہ ہماری فقہ کے تمام ائمہ ہم سب کے مشترک امام ہیں اور ان کے فقہی اجتہادات سب، بلا امتیاز و تفریق، ہمارا مشترک سرمایہ ہیں۔ ہمارے اصحابِ علم کا فرض ہے کہ وہ اس پورے ذخیرہ کا بغیر کسی تعصب و تنگ نظری کے جائزہ لیں اور ان کے جن اجتہادات کو کتاب و سنت اور عقل و مصلحت سے اوفق پائیں ان

کو اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کے لیے اختیار کریں اور دوسروں کو اختیار کرنے کا مشورہ دیں۔

ظاہر ہے کہ اس نصب العین کے حصول کے لیے ہمیں سب سے پہلے اپنے تعلیمی اور تبلیغی نظام کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ موجودہ مدارس کو، خواہ وہ جدید ہیں یا قدیم، بالکل نئی بنیادوں پر استوار کیے بغیر اس راہ میں کوئی نتیجہ خیز کوشش نہیں ہوگی۔ ان اداروں کو نیا نصب العین بھی دینا ہوگا، ان کے لیے مقصد کے مطابق نیا موادِ تعلیم اور جدید نظامِ تربیت بھی فراہم کرنا ہوگا اور معلموں و مربیوں کو نئے تصورِ تعلیم و تربیت سے آشنا اور مانوس بھی کرنا ہوگا اور ان سب کاموں سے کٹھن کام یہ ہوگا کہ اس کی مزاحمت کے لیے جو عناصر سر اٹھائیں گے، خواہ اندر کے ہوں یا باہر کے، ان سے بہرحال نمٹنا ہوگا، تدبر اور تدبیر سے بھی اور حالات مجبور کر دیں تو طاقت سے بھی۔

یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم و تربیت کے نظام میں جو دو عملی، بلکہ صحیح لفظوں میں جو بدعملی پائی جاتی ہے وہ یک قلم ختم کر دی جائے۔ صرف ایک نظامِ تعلیم ہو جو شہداء اللہ فی الارض کی ایک امت تیار کرنے کے نصب العین کو سامنے رکھ کر ہر شعبۂ تعلیم کی نگرانی کرے۔ جدّوجہد دور کے تمام اعلیٰ علوم کے ساتھ اعلیٰ عربی زبان اور قرآن وحدیث اور اسلامی فقہ اور قرآنی حکمت و فلسفہ کی تعلیم کا ایسا بندوبست کیا جائے کہ ہمارے نوجوان نہ دنیا کے علوم میں کسی احساسِ کمتری کے شکار ہوں نہ اپنے دین کے معاملہ میں۔

ٹی وی کو اگر تعلیم و تبلیغ کے لیے خاص کیا جا سکے تو اس کی بڑی افادیت ہے لیکن اگر یہ ناممکن ہے، اس کی اصلاح نہ ہو سکے تو پھر بہتر ہے کہ اسلام کا نام نہ لیا جائے۔ اس کے موجودہ شکل میں ہوتے ہوئے ناممکن ہے کہ کوئی اسلامی جدّوجہد کامیاب ہو سکے۔

ہمارے اخبارات بالخصوص اردو اخبارات کا حال بھی نہایت مایوس کن ہے۔ لیکن ان کی اصلاح ناممکن نہیں ہے۔ اگر حکومت چاہے تو ایک دن میں ان کو شریفانہ روش اختیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ وہ کسی جبر کے بغیر ہی درست

ہو جائیں۔ بشرطیکہ جو لوگ معاملات کے سربراہِ کار ہیں وہ اپنے مذاق درست کریں۔

مساجد کے ائمہ کے ذریعہ سے جو فتنے لوگوں کے اندر پھیلتے ہیں ان کا سدِباب فی الحال مشکل ہے۔ اس میں بے علمی کو بھی دخل ہے اور اُن گروہی تعصبات کو بھی جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ تعلیمی نظام کی اصلاح سے یہ خرابی دور ہو سکے گی۔

یہ ہم نے چند اصولی باتوں کی طرف اجمال کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ جو لوگ اس قوم اور حکومت کی خدمت سے متعلق اپنا فرض ادا کرنا چاہتے ہوں، خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہوں، وہ ان مقاصد کو لوگوں کے ذہنوں سے قریب لانے کے لیے جو کوشش بھی کریں گے وہ ان شاء اللہ اس کا اجر پائیں گے۔

چوتھی قسم کی حکومت :

چوتھی قسم کی حکومت اصل آئیڈیل اسلامی حکومت ہے۔ یہی ہر مسلمان کا مطلوب و مقصود ہونی چاہیے۔ یہ اگر حاصل ہو تو اس کی خدمت و حفاظت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینا مسلمان کے لیے سعادتِ دارین ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ نہ یہ کہیں بنی بنائی موجود ہے اور نہ آسانی سے بن سکتی ہے۔ تاہم یہ کوئی خیالی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ عملاً اس دنیا میں وجود پذیر ہو چکی ہے۔ صحیح نہج سے جدوجہد کی جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں ہے کہ وہ پھر اس کا جلوہ دکھا دے۔ اور فرض کیجیے یہ سعادت نہ بھی حاصل ہو سکے تو اس کے حصول کے لیے جدوجہد کی راہ اب بھی کھلی ہوئی ہے۔ ہم اس مبارک مقصد کے لیے جدوجہد کر کے اپنی پاکیزہ نیت کا ثواب تو حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ اس مقصد کے لیے جدوجہد کا طریقہ بعینہٖ وہی ہے جو اس ریاست سے متعلق ہم نے بیان کیا ہے۔

کتابت : ——— خورشید خاور